

ان میں سے کتنی کے لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ جنہوں نے کاروبار چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی تھی ان کی تعداد بہت کم تھی۔

چالیہ گوش کے ویشیوں کا سب سے بڑا گھر انا آصف تھا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آصف صاحب فکر تھے۔ اس کے فکر میں انفرادیت تھی۔ اور یہ انفرادیت صرف فکر کی حد تک محدود نہ تھی۔ وہ سوچتے تھے اور اسے فوراً عمل میں لانے کے قائل تھے۔ فکر کی اس عادت کی وجہ سے انہوں نے زندگی میں پہنچنے والے اصول مرتب کئے تھے جن پر شدت سے پابند ہونے کے باوجود وہ اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ زندگی اصول سے زیادہ اہم ہے۔

نامن اپور میں لوگ آصف کی عزیت کرتے تھے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ہندو اپنی امامتیں آصف کے پروردگردیتے دیلش اپنے جھگڑوں کے تفصیل کے لئے آصف کو پیغبان نے پرخوشی محسوس کرتے لیکن آصف کے اپنے گھر میں ان کے خیالات کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان کی بیوی کو ان کی رائے مشورے یا فصلے پر قطعی اعتماد نہ تھا۔ گھر میں ہر بات پر انہیں جھاڑ جھپٹ ہوتی تھی۔ جسے وہ سر جھکا کر سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خیال اور رائے پر قائم رہتے اور وہی کرتے تھے جو ان کے خیال میں درست ہوتا۔

آصف نے زیادہ تر زندگی جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں گزاری تھی۔ جہاں ان کا ایک اعلیٰ قسم کا ہوٹل تھا۔ جس میں بڑے بڑے اہل کار اور یورپین آکر ٹھہر تے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دوسروں کی بات غور سے سننے کے عادی ہو چکے تھے ان کی طبیعت میں اخلاقی تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ وہم کی بیماری میں بتلا تھے۔ جو کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

تین بیٹوں کے علاوہ آصف کی ایک بیٹ بھی تھی۔ جس کا نام بلند بخت تھا۔ بلند بخت نے چند ایک جماعتوں تک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اور پھر آصف نے اسے

مدرسہ سے اٹھالیا تھا چونکہ مستور کے مطابق نامن پور کے لوگ بچیوں کو زیادہ پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ آصف خوفہ تعلیم کے حق میں تھے ممکن ہے ان کی بیگم نے زبردستی بلند بخت کو مکتب سے اٹھالیا ہو۔

بلند بخت ابھی غنومن شباب میں ہی تھی کہا سے ایک قریب رشد دار کے بیٹے سے منسوب کر دیا گیا۔ اور جلد ہی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

لڑکے نے دو لہا بنتے سے پہلے بار بار اپنے والدین کو کھلوایا تھا کہ اس کی شادی نہ کی جائے چونکہ وہ شادی کے قابل نہیں۔ لیکن والدین نے اس کی بات کو درخور اعتنانہ سمجھا۔ شاید وہ یہ بھتی تھے کہ لڑکا ویسے ہی انکھچا تا ہے اس کے ذہن پر عورت کا ذرحوی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوں ہو جائے گا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سامان کو دیکھ کر جو آصف جیزیر کے مشتاق تھے لڑکا چاہے قابل ہو یا نہ ہو۔ سامان پر قبضہ جمانے کے تزوہ قابل تھے۔ لہذا انہوں نے لڑکے کی بات نہ سنی۔

بلند بخت شب عروی میں دو لہا کا انتظار کرتی رہی۔ دو لہا کے والدین اسے ڈھونڈتے رہے۔ آخر بات تکل گئی کہ دو لہا خاتم ہے۔ بلند بخت نے سناتو اسے ایک دھچکا لگا۔ اس کی حیات مخدود ہو گئی۔ نسائی تقاضوں کے راستے مسدود ہو گئے۔ نہیں ایک زبردست بیجان سے ٹکرائیں اور حیات کا وہ فیوز ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔ جو اس کی نسائی زندگی میں تحریک پیدا کر سکتا تھا۔

اگلے روز اس کے والدین بلند بخت کو اپنے گھر لے گئے۔

پہلے تو موہوم سی امید باقی تھی۔ کہ شاید دو لہا کسی روز گھرو اپس آجائے پھر جوں جوں وقت گز رتا گیا مایوسی گہری ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ سات سال گزر گئے۔

دیش لوگوں میں طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک طلاق کا لفظ گالی کے مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برداری میں ہمیشہ کے لئے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہذا بلند مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برداری میں ہمیشہ کے

لئے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہذا بلند بخت کی دوسرا شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔  
بلند بخت نگہت کی شہمیلی تھی اور نگہت رنگی اور مانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یا شاید  
فطری طور پر نامن پور کی عورتوں سے ہٹ کر تھی۔ ہاجڑہ کی بات سن کی اسے فوراً بلند  
بخت کا خیال آیا تھا۔ رنگی نے اس کی باری میں ہاں ملائی تھی۔ اور مانی عملی طور پر اس  
سلسلے میں کوشش کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مل کر  
برداری میں بات چلا دی۔ اور پچھے حیرت پچھے تعجب اور عورتوں کے ناک بھومن  
چڑھانے کے بعد بلند بخت کو طلاق ہو گئی ایک مختصر سی رسم بے پس منظور۔ بلند بخت کا ایسا  
سے عقد ہو گیا۔ اور وہ ایسا کے گھر آگئی۔ اور ایسا نے دیکھا کہ اس کے گھر ایک لاش  
پڑی ہے اور زندگی بھر اسے یک لاش اٹھائے پھرنا ہے۔  
بلند بخت کو دیکھ کر ایسا کو ایک دھچکا لگا۔

اگر وہ اس بات پر مصر تھا کہ کسی نوجوان اڑکی سے اس کی شادی نہ کی جائے۔ ظاہر  
وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی حسین نہ ہو۔ لیکن نہ ہو۔ اس وقت اس کی عمر  
چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شدت بھری زندگی بر کرنے کے بعد وہ تحکم چکا  
تھا۔ اکتیا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش سکون واطمینان تھا۔ اس کے علاوہ  
اسے یقین تھا کہ وہ عالی کے لئے شادی کر رہا ہے۔ اگر اس کے گھر میں بیوی آگئی تو  
ممکن ہے وہ اپنی بیوی میں اس حد تک کھو جائے کہ قریب ہی عالی بلو جہی کی گود  
میں پڑا بلکہ تار ہے اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ بلکہ رہا ہے۔ رو رہا ہے۔ پریشان حال  
ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود بلند بخت کو دیکھ کر ایسا کو ایک دھچکا لگا۔  
لیکن جلد ہی اس نے جواز پیدا کر لیے شاید یہی مناسب تھا کہ بلند بخت اس کی  
بیوی بنے۔ جیون ساتھی نہ بنے۔ ورنہ عالی تنہار رہا جاتا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی  
دینے کی کوشش کی کہ ضرور اس میں قدرت کا ہاتھ ہے۔

وقت یہ تھی کہ بلند بخت اس گز شستہ سانحہ کی وجہ سے بالکل ہی مایوس ہو چکی تھی۔

بلند بخت کے خیالات بعد پاکیزہ تھے لیکن یہ پاکیزگی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر سنپیش بلکہ ایک پھوٹا تھا جس میں مسلسل درد رہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی تھی کہ خاوند اس سے دور رہے بلند بخت کی آمد پر ایلی نے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ایلی اور عالی فرحت کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر منتقل ہو گئے۔

## مشعلات

ایلی کو سیاست سے قطعی طور پر دچکی تھی۔ اخبار القوہ پڑھتا تھا لیکن سیاسی خبروں کے متعلق اسے دچکی نہ تھی۔ صرف سرخیاں پر ہر مضمون ہو جاتا۔

جب ہندوستان کی آزادی کی آواز بلند ہوئی تو ایلی کو بعد خوشی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک آزاد ہو جائے۔ اور کوئی بیرونی طاقت اس ملک پر مسلط نہ رہے۔ ایلی کے دل میں ان مجاہدوں کے لئے احترام تھا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے لیڈروں پر ناز کرتا تھا۔ مثلاً مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح۔ اس کے باوجود اس نے کبھی کسی سیاسی مجلس میں حصہ نہ لیا تھا۔ اور نہ ہی ان محظوظ لیڈروں کو کبھی دیکھا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں سیاسی بیداری بڑھ چکی تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں سیاسی جذبہ یوں لہریں لے رہا تھا کہ ذاتی مسائل بھی پس پشت پڑ چکے تھے۔

پاکستان کے قیام کا سوال ان دنوں پیش پیش تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی دھوم پھی ہوئی تھی یوپی کے مسلمان پاکستان کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں علم و ادب کی جگہ سیاست کا ابال آیا ہوا تھا۔

لیکن ایلی اس جھگڑے سے بالکل بے گانہ تھا۔ وہ پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ وہ پاکستان کے خلاف بھی نہ تھا۔ اس نے کبھی اس مسئلے کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ وہ چاہتا

تھا کہ ہندوستان کو آزادی مل جائے۔ اور لوگوں کی اور ملک کی اس میں بہتری ہے تو پاکستان کا قیام عمل میں آجائے۔ بہر حال وہ ہر اس بات کا طرف دار تھا۔ جو عوام اور ملک کی بہتری کے لئے تھی۔ لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ ملک کی بہتری کس بات میں ہے۔

پنجاب کے مسلمان پاکستان کے حق میں تھے۔ اس وجہ سے کبھی کھاراں کے دل میں بھی پاکستان کے لئے جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن وہ جذبہ محض وقتی ہوتا۔ یا کبھی کھار بیٹھے بیٹھائے اس کے روپر وہر م سالہ کا سکول ابھرتا۔ چھٹی جماعت کا رُکارام لال اس کے سامنے آ کھرا ہوتا۔ ”رام لال مجھے ایک گلاں پانی لاؤ۔“ ایلی کہتا۔ رام لال کی گردان جھک جاتی اور وہ چپ چاپ جوں کافیں کھڑا رہتا۔ ”رام لال۔“ ایلی چلاتا۔ ”تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔“ ”جی میرا دھرم بھر شٹ ہو جائے گا۔“ ”رام لال جواب دیتا۔ ”بے قوف لڑ کے۔“ ایلی نہستا۔ ”اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پیو تو دھرم بھر شٹ ہو گانا۔ اگر تم مجھے پانی لا دو تو تمہارا دھرم بھر شٹ ہو سکتا ہے۔“ ”رام لال اسی طرح گردن جھکائے کہتا۔ ”جی میرا دھرم بھر شٹ ہو جائے گا۔“

پھر اس کے روپر وہر م سالا کا پڑوئی آ کھرا ہوتا۔ ”جی میرا نام رام دین ہے۔“ ””رام دین؟““

”جی میں بھگوان کی دیا سے مسلمان ہوں۔“

”مسلمان۔“

”جی جی۔“

پھر ایلی کی نگاہ میں رام دین کی کشیا ابھرتی۔ وہ چونکا۔ وہ پوتز گور کا دھیر کا نس پر دھری ہوئی مورتیاں۔

”جی میں مسلمان ہوں۔“ ”رام دین چلاتا۔“ اور پھر تمام ہندوستان کے مسلمان اس کے سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہو کر چلاتے۔ ”جی میں بھگوان علی ہوں۔ جی میں

کرشن اللہ ہوں۔ جی میں غلام گروہوں۔ ہم مسلمان ہیں۔“ وہ چلاتے۔ ”پاکستان زندہ باد پاکستان زندہ باد۔“ اس کے دل میں کوئی نظرے لگاتا۔ لیکن جلد ہی ایلی چونکتا۔ ”خوبیں نہیں،“ وہ چلاتا۔ اگر رام لال اس قدر تگ خیال واقع ہوئے ہیں کہ کسی کو پانی پلانے سے ان کا دھرم بھر شد ہو جاتا ہے۔ یا وہ اپنے درمیان رہنے والے اکے دکے مسلمان کو رام دین بنادیتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوؤں کے خلاف ایسے بغض پاک کر میں رام لال بن جاؤں۔ نہیں نہیں وہ چلاتا۔ ان باتوں پر ہندوؤں کے خلاف تعصیب پال لیتا اچھا نہیں۔

اگر چہ اسلام کے اصولوں کا وہ مداح تھا اور فلسفہ مذہب کے مطابق اسلام کی عظمت کا قائل تھا۔ لیکن یہ احساسِ محض ذہنی تھا جس کا عکس اس کے جذبات پر نہیں پڑتا تھا۔

ایک روز جب وہ لاہور کی مال روڈ پر گھوم رہا تھا تو فجٹا ایک شور باندھوا۔ وہ رک گیا۔ مال روڈ پر ٹھلنے والے سمجھی لوگ چونک پڑے۔ ہندو اور سکھوں کا یک جم غیر مال روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جنہیں وہ لہرار ہے تھے۔ عورتیں سر پیٹ رہی تھیں۔ بیان کر رہی تھیں۔ وہ سب اسمبلی چیئر کی طرف بھاگ رہے تھے اور پاکستان مردہ باد کے نظرے لگا رہے تھے۔

اس جلوں میں ایک شدت تھی اشتعال تھا۔ ای وحشت تھی جس میں تشدود کی واضح دھمکی تھی لوگ حیرت سے اس دوڑتے ہوئے تشدید بھرے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ پھر دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک خوف ابھرا اور وہ اپنے اپنے گھر کی طرف بھاگ گے۔ ایلی چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

”اجی صاحب میری بیٹی تو ہندوؤں کے محلے میں رہتی ہے۔“ کوئی اس کے قریب کہہ رہا تھا۔

”یہو بھس میں چنگاری ڈالنے والی بات ہے۔“

”ظاہر ہے کہ مجھے بونجھے پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔“

”نہ جانے کس وقت خون کی ندیاں چل لگیں۔“

”بھائی میں جا کر بیٹی کی خبر لیتا ہوں۔ حالات نازک ہیں۔“

حالات نازک ہیں۔ حالات نازک ہیں۔ ایلی کے سر پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے دفعتاً اسے فرحت کا خیال آیا۔ اسے فرحت بھی تو ماڈھوپورہ میں رہتی ہے جہاں ہندوؤں کا گڑھ ہے وہ بے سوچے مجھے ماڈھوپورہ کی طرف بھاگا۔ ماڈھوپورے کے بڑے بازار میں لوگ یہاں وہاں گروہوں میں کھڑے تھے ان کے تیورا چھے نہ تھے۔

پیشائیون سے شدید ہرے الادے ظاہر ہو رہے تھے ہر آتے جاتے کو مندوش اور مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایلی نکھل بچا کر چڑھا بارے پر چڑھ گیا۔

”چلو فرحت۔“ اوہ بولا۔ ”یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں چلو میرے گھر چلو۔“

ابھی وہ تیار ہی نہ ہوئے تھے کی نیچے بازار میں چوریج گیا۔ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔ انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بازار میں ایک تانگہ کھڑا تھا زمین پر تانگے والے کی لاش روپ رہی تھی۔۔۔ پاس ہی ایک ہندو بڑھایا چلا رہی تھی۔۔۔ اے تمہیں بھگوان کا ڈر نہیں کیا بچارا مجھے بچا بچا کر لایا تھا۔ کہتا تھا مار جی میں لے جاتا ہوں چاہے میری جان جائے پر تم پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے گا۔ ہائے جامویہ کیا کیا تم نے۔۔۔ وہ رور پھی تھی بین کر رہی تھی۔

فرحت گھبرا گئی اجمل باہر دورہ پر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف عورتیں اور بچیاں تھیں۔ اکیلا ایلی انہیں سنبھال نہیں سکتا تھا۔ ایلی کا اپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے انہیں جانا چاہئے یا نہیں ممکن ہے وہ وہیں گھر میں محفوظ ہوں۔ لیکن شام پڑ چکی تھی۔ اور پھر رات کے وقت نہ جانے کیا ہو۔ اسے اسی وقت ایک فیصلہ کرنا تھا۔

عین اس وقت دروازہ بجا۔

ایلی گھبرا گیا۔ شاید وہ آگئے۔ اشید انہوں نے ہله بول دیا ہے۔

”کون ہے؟“ اس نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔

”میں ہوں۔ مانی۔ کھولو جلدی۔“

”مانی۔“ ایلی مانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جلوس کو دیکھ کر مجھے فوراً ہن فرحت کا خیال آیا مانی اندر داخل ہو کر چلانے لگا۔

”چلو چلو۔“ وہ چلا یا۔ ”آ جاؤ آ جاؤ۔ سب آ جاؤ درونیں۔“

”لیکن ایلی بولا۔“ باہر وہ سب کھڑے ہیں۔ اگر

مانی سن کر چلایا۔ ان کی ایسی تیسی۔ لائے وہ کیا بلکہ اسیں گے ہمارا۔ چلو

مشیرہ

”لیکن ٹھہر وہ سو نادے دو مجھے بس ٹھیک ہے چار پانچ کو مارے بغیر تو نہیں مر دیں۔ جب تک تم انہیں نکال کر لے جانا۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“ وہ خوشی میں چلا یا۔ وہ سب چل پڑے۔

چوک میں ہندوؤں کے جھتوں نے ان بر قعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھا۔

”مانی نے لٹھہ رائی اور نعرہ لگایا۔“

وہ آپس میں کھر پھر کرنے لگا۔

مانی لٹھہ رائے جا رہا تھا۔ ”جاؤ چلتے جاؤ۔“ وہ ایلی کی ہمت بڑھا رہا تھا۔

ایک نوجوان ان کی طرف بڑھا۔

مانی نے ایک چنگاڑا ماری۔ ”مولاعلی۔“ وہ لاٹھی گھمنے لگا۔

وہ گھبرا کر پرے سرک گئے۔

”جلدی چلو جلدی چلو۔“ ایلی عورتوں کو ہاٹک رہا تھا۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔“ ایک بوڑھا تانگے والا چلایا ”آ جاؤ۔“ اس نے بر قعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اللہ اپنا فضل کرے۔“ وہ بھول چکا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندو محلے میں کھڑا چلا رہا ہے۔

پھر وہ سب تانگے میں سوار تھے۔ اور تانگہ بھاگ رہا تھا۔

”اجی صاحب۔“ بڑھا کہہ رہا تھا۔ سارے شہر میں چھپری چل رہی ہے۔ مرٹکوں پر لاشیں پڑی ہیں۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ آگ لگ گئی ہے شہر میں۔ اللہ اپنا فضل کرے انہوں نے سوئے شیروں کو جگایا ہے۔ ہمیں للاکارا ہے انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ فرض کرے۔ اللہ فضل کرے۔“

### پاکستان زندہ باد

اس جلوس کے بعد شہر میں ایک طوفان آگیا۔ چھپر اگھوپنے کی واردات میں شروع ہو گئیں۔ محلوں میں جانا خطرناک ہو گیا۔ حتیٰ کہ مرٹکوں پر چلانا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ ایک روز جب ایلی شام کے وقت گھر آ رہا تھا تو مرنگ کے نوجوان چھوکروں نے اسے روک لیا۔

”اے او۔“ ایک نے للاکار کر کہا۔

ایلی نے ان کی للاکار کی پرواہ نہ کی۔

”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ چلانے۔ انہوں نے اس کی سائیکل روک لی۔

ایلی کو غصہ آگیا۔ غالباً اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان محلے میں پکڑا گیا تھا۔

”اے کون ہے تو“ ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

”تجھے اس سے کیا۔“ ایلی نے کہا۔

”میں کہتا ہوں یہ ہندو ہے۔“ ایک بولا۔

”پھر تجھے کیا تکلیف ہے۔“ ایلی چلایا۔

”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ سب اس کی طرف بڑھے۔

”بڑے مجاہد بنے پھرتے ہو۔“ ایلی چلانے لگا۔ ”اللہ اور محمد کی خدمت کر رہے ہے۔“

”اے مسلمان ہے یہ۔“ ایک بولا۔

”غیریں نہیں بچنے کے لیے اللہ کا نام لیتا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”کلمہ پڑھ۔“ ایک چلانے لگا۔

”اللہ کا نام نہ لیتا تو اب تک ڈھیر ہوتا۔ میرا ہاتھر ک گیا۔“ ایک غنڈہ بولا۔

ایمی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو ہے۔

اس روز ایمی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان تھا۔ سیاسی خیالات کا سوال نہ تھا۔ مسلم

لیکن اور کانگریس کا سوائٹ تھا۔ یہ سوال نہ تھا کہ آیا وہ اسلام سے واقف ہے۔ آیا وہ

شریعت کا پابند ہے یہ سوائٹ تھا کہ آیا رام دین ہما مسلمان ہے یا محمد علی سا۔ سوال

صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا نہ۔ اس روز جب وہ ماڈھوپورہ سے باہر نکلے تھے تو

ہندوؤں کے گروں کے گروہوں نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ آیا وہ نیشنل نقطہ نظر کے حامل

تھے۔ یا مسلم لیکن آیا وہ پاکستان کے حق میں تھے یا پاکستان قیام کے خلاف تھے۔ ان

کی نگاہ میں وہ صرف مسلمان تھے۔ تانگے والے کے پیٹ میں چھپرا گھونپتے وقت

بھی ہندو بڑھیا کے چلانے کے باوجود انہیں یہ احساس نہ ہوا تھا کہ تانگے والا ہندو ما

تا جی کو مسلمان غنڈوں سے بچا بچا کر ماڈھوپورہ میں لایا تھا۔ اور اس نے ماتا جی کو

یقین دلا�ا تھا کہ وہ ماتا جی کو طچانے کے لئے اپنی جان تک دے دے گا۔ چاہے وہ

ماتا جی کو بچا کر لایا تھا۔ چاہے ہندوؤں کی خدمت کی تھی لیکن وہ مسلمان

تھا اس لئے انہوں نے اس کے پیٹ میں چھپرا جھونک دیا تھا۔

ایمی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان ہی نہیں وہ بذات خود پاکستان ہے۔ چاہے وہ

پاکستان کے حق میں تھا۔ یا خلاف چاہے وہ اسلام سے بیگانہ تھا چاہے وہ مذہبی

تعصیب سے بے نیاز تھا۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اس کے دل میں کوئی چلا رہا تھا

پاکستان زندہ باو۔

ایمیل کے تمام تر خیالات درہم برہم ہو رہے تھے۔ اس کا ذائقہ گویا از سر نو ترتیب پار ہا تھا۔ پرانے خیالات کی ایٹیٹیں اکھڑی جا رہی تھیں۔ نئی ایٹیٹیں نہ جانے کہاں سے آگئی تھیں اور اس کے ذہن میں آپ ہی پہنچ گئی جا رہی تھی۔

اسی روز شام کو ففتر سے آتے ہوئے وہ ان جانے میں انارکلی کی طرف گھوم گیا۔ حالانکہ اسے ادھر کوئی کام نہ تھا۔ اور ان دنوں بے کار گھومنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا چونکہ شہر میں چھرا بازی کی واردا تیکی بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور ادھر ادھر گھومنا خطرے سے خالی نہ تھا۔  
کچھ دیر وہ انارکلی میں گھومتا رہا پھر سر کر روا کی طرف چل پڑا اور آخر کار اس نے دیکھا کہ وہ داتا صاحب کے مزار کے باہر گھڑا ہے۔

داتا کے مزار پر وہ کئی مرتبیہ گیا تھا چند بار وہ مزار کے اندر بھی داخل ہوا تھا لیکن جب وہ اندر جاتا تو اس کی توجہ ان عورتوں کی طرف منعطف ہو جاتی جو بن سنور کر داتا دربار میں حاضر ہوتی تھیں۔ اور وہاں پہنچ کر اپنی نماش کرنے کے خیال سے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں ہیرا منڈی کی طوالیں ان دنوں داتا بڑی متواლی تھیں۔  
کیوں نہ ہوتیں۔ وہاں جانے سے ان کا حلقہ احباب و سیج تر ہوتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ایمیل عورتوں کو دیکھنے کی غرض سے وہاں کبھی نہ گیا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اس نے عورتوں کے سوا پھر وہاں ملنگ تھے جو طوائف کی طرح اپنی نماش کرنے میں مصروف رہتے تھے مزار کی جانی کے گرد گھرے لوگوں کو ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ایمیل کے ہونٹ نفرت سے بٹوہ بن جاتے ضعیف الاعتقاد لوگ۔!

اس روز داتا صاحب کے مزار کے خیالات کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔  
پاگ بابا سامنے محراب کے نیچے کھڑا تھا۔ ”کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ اور تمہیں داتا کے قدموں میں لاکھڑا

کیا۔ کیا نہیں کیا کس جگہ تمہاری حفاظت نہیں کی۔ ماڈھو پورہ سے کس نے لکالا۔ مزگ میں کس نے بچایا۔ وہی بچانے والا ہے وہی سب کچھ کرتا ہے۔ میں کیا ہوں میں کیا ہوں وہی کرنے والا ہے۔

ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خونہیں آیا ہو بلکہ اسے بلا یا گیا ہوا اور اندر داتا اس کا انتظار کر رہے ہوں۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ نہیں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مر جم ہے یا گنہگار ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خوش نصیب ہے اور اسے شاہ کے حضور میں لکھرے ہونے کا موقع ملا اس کا سر جھک گیا۔ ہنکھیں بند کر لیں۔ زکا ہوں تلے روپی توپی والا لکھڑا تھا جس کے ساتھ دراز قد تھا دونوں داتا سے اس کی سفارش کر رہے تھے۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ داتا صاحب سے کیا کہے۔ فعتا حاجی صاحب آگئے ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ہل رہا تھا۔ ”وقت آئے گا وقت آئے گا۔“

وہ دلبی دلبی زبان سے کہہ رہے تھے۔

”تمہاری نئی زندگی شروع ہو گی، شہزاد مسکرا رہی تھی۔“ نیا جیون۔

”وہی کرنے والا ہے وہی کرنے والا ہے۔“ پاگ بابا چلا رہا تھا پھر ایلی کی نگاہوں تلے ایک کنوں ابھر آیا۔ اس کے قریب ہی سفید چادر اوڑھے ایک مسجد چپ چاپ آئی۔ پھر ایک چارو یواری ابھری تھی اور اس چارو یواری کے اندر ایک تعمیر و شیخ ہو گیا۔

داتا مسکرا رہے تھے۔

## پریختاں

جب وہ واپس آ رہا تھا تو راستے میں ناظم کو دیکھ کروہ جیران رہ گیا۔ ناظم اسے دیکھ کر یوں کھل گیا ہے۔ جیسے مٹھاں کی وجہ سے خربوزہ پھوٹ جاتا۔ ”میں تمہارے دفتر سے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ صح سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ صح سے۔

”تم یہاں کیسے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”میرا تباہ لہ ہو گیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”بڑے دفتر ہیں۔“

”اچھا۔“

”اب میرے ساتھ چلو۔“ وہ بولا۔

”ارے کہاں؟“

”بس آ جاؤ۔ آ جاؤ شاید وہ مل جائے۔“ ناظم بولا۔

”کون مل جائے؟“

”بھئی وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”کون انتظار کر رہی ہے۔“

”تم آ جو تو۔“ وہ بولا۔

”پھر بھی۔“ ایلی نے اس کی منٹ کی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”بھئی وہ آندھرے فلم کمپنی کی مالک ہے۔“

”ارے اسے مجھ سے کیا کام؟“

”میں نے کہا تھا اس معاملے میں میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ میرا ایک ووست ہے ایلی۔“

”تو اس نے کہا مجھے اس سے ملا دو۔“

ایلی جیران تھانا ناظم کیسی باتیں کر رہا ہے۔

”اب اس سے بات کرو چل کر۔“ ناظم مسکرا یا۔

”لیکن کس سلسلے میں۔“ ایلی نے چڑھ کر کہا۔

”بھئی اسے اپنی فلم کے لئے ایک آئیڈی یا چاہئے۔“ وہ بولا۔

”آئیڈی یا۔“ ایلی کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔

ناظم زبردست اسے بریگز اہولی میں لے گیا۔ جہاں پریختاں بھری تھی۔ انہوں نے اندر اپنا کارڈ بھیجا اور انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد پریختاں نے انہیں اندر بالیا۔

وہ ایک بندی سنوری ہوئی میٹر عورت تھی۔ جیسے چینی کی گڑیا ہو۔ ان کے روپ و بیٹھے ہوئے وہ فلمی ادارے کی مالکہ کم دکھائی دیتی تھی۔ عورت زیادہ ایساں کی طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلاکا ساتھ سامنہ آیا۔ جس میں طنز کی جملک تھی۔

”آپ ایسا حصہ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ایسا جواب دیا۔

”کیا آپ کو فلم سے پیش کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ویکٹا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”صرف۔“

”فلم سازی سے واقعیت ہے کیا؟“ وہ بولی۔

”جی نہیں۔“

”فلمی کہانی لکھنی ہے کبھی؟“

”جی نہیں۔“

”ناظم صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔“ پریختاں طنزیہ انداز سے مسکرائی۔

”ان کا حسن ظن ہے۔“

ناظم نے غصے سے بھری نگاہ ڈالی۔

آئیڈیا

”مجھے ایک آئیڈیا کی تلاش ہے۔“ پریختاں بولی۔

”جی۔“ وہ بولا۔

”ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں۔“

”اس وقت شاید یہ ممکن نہ ہو۔“ ایلی نے جواب دیا۔  
”کیوں؟“ وہ بولی۔ اس کی وجہ ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”گزشتہ دو روز سے میں چاراً یک اصحاب سے ملی ہوں لیکن  
بات نہیں بنی۔“  
”کیا وہ لوگ آپ سے ملتے تھے؟“ ایلی نے کہا۔  
”ہاں ہاں وہ مجھ سے ملتے تھے۔“  
”اور وہ آپ کو آئیڈی یا نام دے سکے؟“  
”بالکل نہیں دے سکتے۔“  
” وجہ ظاہر ہے۔“ ایلی نے کہا۔  
”کیا مطلب؟“ وہ بولی۔ ”میں بھتی نہیں۔“

”ویکھئے شریعتی۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ موجود ہوں تو کوئی دوسرا آئیڈی یا نام  
آتا۔“

پریختاں کے چہرے پر رنگ پھیل گیا۔ ایک چمک لہرائی۔ ”کیا مطلب؟“ وہ  
بولی۔

”مطلب یہ۔“ ایلی نے کہا کہ ”آپ مرکز بن جاتی ہیں۔“  
”عجیب بات کی ہے آپ نے۔“ وہ مسکرائی اور پہلی مرتبہ طنز و تحقیر کے بغیر اس کی  
طرف دیکھا۔

”وراصل“ وہ بولی۔ ”مجھے اپنے نئے فلم کے لئے ایک آئیڈی یا چاہئے۔“  
”کس قسم کا آئیڈی یا۔“

”میں عورت اور مرد کی زندگی کا کمپیر یون کرنا چاہتی ہوں۔“  
”آپ کا مطلب ہے موازنہ۔“ ناظم نے کہا۔  
”ہاں ہاں۔“ وہ بولی — ”موازنہ۔“

”تو کیجھے۔“ ایلی نے کہا۔ ”آئیڈیا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ آئیڈیا تو آپ ہی کا ہوا۔“

اس نے پھر ایلی کی طرف دیکھا۔ ”لیکن کسی طریق سے اسے پیش کیا جائے؟“

”اس میں تو کوئی مشکل نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مشکل۔“ وہ بولی۔

”مشکل۔“ ایک ساعت کے لئے اس نے توقف کیا۔ ”دنیا میں تبدیلی جنس کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک لڑکی کے خیالات اور جذبات پیش کیجھے۔ پھر لڑکی کی جنس تبدیل کرو جائے اور بحیثیت مرد اس کے خیالات اور جذبات پیش کیجھے۔“

”واہ واہ اکسیلوٹ۔“ وہ اچھل پڑی۔ ”واہ اصفی صاحب۔“

ناظم نے فخریہ انداز سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”ایک صورت اور بھی ہے۔“ ایلی بولا۔

”کہیے۔“ وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

”ایک داکٹر تبدیلی جنس کا راز پالیتا ہے۔ پھر وہ باری باری عورت اور مرد بن کر جیتا ہے۔ تفریحاً اس طرح موازنہ بہتر ہو گا۔“

”بہت خوب۔“ وہ بولی۔

”پھر اسے ایک مشکل میں وال دیجئے۔ اور اسے فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اسے ہمیشہ کے لئے عورت بن کر جینا ہے یا مرد۔“

”اکسیلوٹ۔“ وہ مسکراتی۔

اس کے بعد دریتک وہ بلیٹھے چائے پیتے رہے۔

چائے کے دوران میں پریختاں نیا پنے بیگ میں سے ایک فارم نکالا۔ اس کے نیچے دخنخڑ کئے اور ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”یہ آفر ہے۔“ وہ بولی۔ ”جب بھی آپ چاہیں میرے سٹوڈیو میں آ جائیں۔ فی الحال میں آپ کو پانچ سور پیہ ماہوار دے سکتی ہوں۔“  
نظم خوشی سے جھوم اٹھا۔

”میری رائے مانیے تو یہ آفر منظور کر دیجئے۔“ پریتھا نے کہا۔ ”آپ کی آمد کا کرایہ میرے فلمے رہا۔“ اس نے سوسوکے پانچ نوٹ بٹوٹے سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”جب بھی آپ کی جگہ چاہئے تو آ جائیں۔“ وہ نہایت لذواز بانداز سے مسکرائی۔  
”هم آپ کا منتظر رہیں گے۔“

پریتھا کی آفر نے ایلی کی زندگی میں باچاں پیدا کر دی۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلم میں کام کرنے کا موقع ملے گا۔ پانچ جو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ملاقات محض ایک خواب تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھے گا کہ وہ کاغذ جو پریتھا نے اسے دیا تھا ایک سادہ ورق ہے۔

نظم اسے اکسارہاتھا:

”تمہیں جانا چاہئے۔ فوراً چلے جانا چاہئے۔ بھبھی کے سٹوڈیو میں کام کرنے کا چانس ہاتھ سے گنوانا عقلمندی نہیں۔“

مانی اس کے ساتھ جانے پر تیار تھا۔ وہ یونٹ کی نوکری سے استغنے والے چکا تھا چونکہ اسے افسر اعلیٰ کی بیگم اور بیٹیوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

مانی نے ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ ایک ناشر سے معاملہ طے کر لیا تھا۔ کہ بھبھی جا کر وہ اعلیٰ پیانہ پر ایک فلمی رسالہ جاری کرے گا۔

بلند بخت اس آفر اور اس کے نتائج سے متعلق بے پرواہ تھی۔ اسے احساس نہ تھا کہ ایسی آفر کا مطلب کیا ہے؟

ہاجرہ خوش تھی: ”ہاں ہاں چلے جاؤ۔ سنائے بھبھی بہت بڑا شہر ہے۔ اگر کام چل لکا

تو بڑی تجوہ آپا دے گے۔“  
ایمیلی تیار ہو گیا۔

اس نے بلند بخت کو نامن پوزیشن دیا۔ پا جرہ اور عالی کو علی پور چھوڑا۔ ان دونوں تقسیم کی بات زبانِ رخلق تھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کو خطہ ہ تھا کہ کہیں لا ہور ہندوستان کا حصہ نہ بن جائے کیونکہ علی پور ضلع گور دا سپور میں واقع تھا اور گور دا سپور میں مسلمان کی اکثریت تھی اس لئے علی پور ایک محفوظ مقام تھا۔ با جرہ اور عالی کو علی پور چھوڑنے کے بعد واپس لا ہور پہنچا اور اپنی اسمی سے استعفی دے کر مانی کو ساتھ لے کر بمبی روائی ہو گیا۔

### بمبی

بمبی کو دیکھ کر ایمیلی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا تنا خوبصورت شہر اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند روزوں بے وقوف کی طرح سراٹھا اٹھا کر ان سر بغلک عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ عمارتوں کی عظمت سمندر کی وسعت اور بھیر کے تسلسل کو دیکھ کر اس کی اپنی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حیر کر بھر رہا تھا۔ پہنچانے کو آئیڈیا دینے سے جو اس میں خود اعتمادی اور فخر پیدا ہوئے تھے، بمبی پہنچ کر صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ گئے۔

دوسرے روز شام کے وقت جب وہ میرین ڈروائی کے قریب ایک باغچہ میں نظر پہنچا ہوا تھا تو دللتا اس نے محسوس کیا جیسے اس کے روپ و حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا سر ہل رہا تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”یہی نفع تھا وہ۔“ وہ بولے۔

”نعم،“ ایمیلی نے دہرا�ا۔

”اسی نفع پر بیٹھے تھے ہم۔“ وہ مسکرائے۔

”ایمیلی کو یاد آگیا۔“ ہاں جب سرمه لگا کر وہ گھر سے نکلے تھے تو

”ان دونوں وہ بمبی ہی میں مقیم تھے۔

یہ کہہ کر حاجی صاحب اس کے قریب آبیٹھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک راہ گیر حسینہ کی طرف دیکھا۔ وہ حسینہ ان کے قریب آبیٹھی۔ وہ دیوانہ وار حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک اور طردار عورت وہاں آبیٹھی۔ پھر ایک میم آئی۔ وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اپنا آپ ان کی بھینٹ چڑھا رہی ہوں۔

پھر وہ اٹھ بیٹھے اور ایلی کے دوہرہ وہ کھڑے ہوئے۔

”بیکار ہے۔“ وہ بیلے ”بیکار سب بیکار ہے۔“

انہوں نے لفترت سے عورتوں کی طرف دیکھا اور چل پڑے۔ ایلی چونکا اس نے گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی۔

”بیکار ہے۔ کھلوئے۔“ حاجی صاحب نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ایلی نے پھر ان خوبصورت عمارتوں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ تلے گئے کرنگدار ڈبے نیچے اور سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ سڑک پر چلتی ہوئی خوبصورت عورتیں گویا کپڑے کی دکانوں کی شووندوڑ سے بھاگی ہوئی پتلیاں تھیں۔

اس نے سمندر کی طرف نگاہ دوڑائی۔

سمندر نے بڑھ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

سامنے مغرب میں افق پر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔

اس روز جب وہ رات کو اپنی جائے قیام پر پہنچا تو وہ سوچ رہا تھا۔ حاجی صاحب کے خیال نے آ کر اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ عجیب بات تھی۔ اس عظیم الشان شہر کو اور ان خوبصورت عورتوں کو بدلتا دیا تھا۔ یہ کیا جادو ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا نقطہ نظر انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ یا ایک عام سا آدمی اتنی

طااقت رکھتا ہے کہ وہ کسی کے زاویہ نظر کو بدلتا رکھ دے۔ زندگی بھر تکے تنگے چن کر جو آشیاں بنایا تھا اسے ایک نگاہ سے تاراج کر دے۔ یہ کسی طاقت تھی۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

حاجی ساحب نے اپنا کار بار جس کی شانخیں ملکتہ بمبئی اور ولی میں تھیں یک قلم چھوڑ دیا تھا۔ آخر کیوں۔ کیا یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا یا ایسے ہی کسی مرد خدا نے ان کا زاویہ نظر بدلتا تھا۔ ایلی کو اس سوال کا کوئی جواب نہ سمجھتا تھا۔ شاید ان عاموں کے پاس اس کا جواب تھا ہی نہیں جن کے علم و فکر پر اس نے اپنے قبیلے نظریوں کی بنیاد استوار کی تھی۔ برٹر غدر سل کھڑا سوچ رہا تھا۔

دستاوہ مسکرا یا:

”بچہ رہتا ہو۔“ وہ بولا۔ ”تو اس کی توجہ کسی اور طرف کر دو۔ وہ خاموش ہو جائے گا۔“

داستوں کی مسکرا رہا تھا: سمجھی بچے ہیں۔  
داستوں کی کہہ رہا تھا: ”اگر انسان میں بچے کا عنصر نہ ہو تو وہ عفیت بن کر رہا جائے۔“

ایلی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سمجھی بچے تھے۔ کیا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ قدرت کی دین تھی۔ کیا زاویہ نگاہ میں معمولی تبدیلی اتنا عظیم فرق پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے روپ و پاگ بابا کھڑا چلا رہا تھا: ”میں کون ہوں۔ کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔“

ایلی کے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ کسی وقت تو اس کی وحشت اس حد تک پڑھ جاتی کہ وہ خود کو کافکا کا میٹا مار فیس سمجھنے لگتا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اس خیال پر وہ بالکل گھبرا جاتا۔

بمبئی میں ایلی کے دھنڈ لکھے میں صرف مانی وہوپ کی ایک شعاع تھی۔ مانی میں

زندگی تھی۔ چمک تھی۔ جوش تھا۔ شوق تھا۔ اس کے نقطہ نظر میں صحت تھی۔ بے پرواٹی تھی۔

وہ سبھی کوشوق سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زگاہ میں خوبصورت عمارتیں گتے کے ڈبے نہ تھے حسین عورتیں درزیوں کے باڑل نہ تھے۔ اس کی زگاہ میں عورتیں عورتیں تھیں اور اس قدر حسین بھی نہ تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ اپنی حیثیت کھود دیتا۔ حسین عورتیں خوب تھیں۔ اچھی خاصی تھیں۔ اس قابل تھیں کہ ان سے دل بہالیا جائے۔

مانی جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی رانیتی تھی۔ وہ اپنی حیثیت کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس میں جھجک نہ تھا۔ ایلی بھی جوانی سے واقف نہ ہوا تھا۔ احساس متوجی کا مارا ہوا۔ زندگی کی راہ پر تھکا ہارا ہوا۔ گزشتہ تلخیوں کی وجہ سے اس کی طبیعت ڈراور گھبراہشوں سے الٹی پڑی تھی۔ اس کے جذبات اور ذہن میں قطعی طور پر ہم آہنگی نہ تھی۔

مانی اور ایلی کو سبھی میں رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ ملی جہاں شاعر اور مصنف رہتے تھے۔ ایلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ادیبوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ وہ عجیب لوگ تھے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہ تھے۔ بات کرنے کے بعد بھی انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ اس بات کا کیا اثر ہوا ہے۔ وہ اثر یا رو عمل سے بے نیاز تھے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔ آیا اسے بات بری لگے گی۔ وہ دوسروں کے احساسات سے بے گانہ تھے۔ دل کی بات کو چھپانے کے قائل نہ تھے۔ وہ خود شوری سے بے گانہ تھے۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں بہاؤ ہے۔ رکاوٹ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ وہ خود پسند ہیں۔ اپنی اہمیت کے چراغ جلانے کے شو قین ہیں اور دنیا کو اپنے مقابلے میں یقین سمجھتے ہیں۔

ان دونوں بھی میں بھی ہندو مسلم فسادات جو من پر تھے چھر اگھوپنے کی وارداتیں عام تھیں۔ اس کے علاوہ! آتشزدگی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ مسلمان اور ہندو علاقوں میں اعلانیہ وارداتیں ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی سول لائنز کے علاقے میں بھی کوئی واردات ہو جاتی اور پچھلے دیرے کے لئے وہ علاقہ ویران دکھائی دیتا۔ پھر جلد ہی لوگ اسے بھول جاتے اور پھر سے آمد و رفت شروع ہو جاتی۔

ایلی خوف کے مارے کبھی ہندو علاقوں میں نہیں گیا تھا۔ سول لائنز میں گھوٹتے ہوئے بھی اس پر خوف مسلط رہتا۔ لیکن مانی بے نیاز تھا۔ اس نے چلتے ہوئے بھی اپنے اردو گرد نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلے جاتا۔ چلتے ہوئے کوئی گیت گلنا تارہتا۔ ایلی کو اس کے بے پروائی پر غصہ آ جاتا اور وہ ہر وقت مانی سے بحث کرتا۔ اسے گھوڑتا۔

ابھی انہیں بھی بھی پہنچنے میں دو ماہ ہی گزرے تھے کہ پرستماں کے نگارخانے کے دروازے پر چار ایک وارداتیں ہو گئیں۔ غنڈروں نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ کہ وہ نگارخانے کو آگ لگادیں گے چونکہ پرستماں کا خاوند مسلمان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نگارخانہ بند کر دیا گیا۔

اس کے بعد مانی اور ایلی کی تمام تر توجہ فلمی پر چے کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو وہ شائع کرنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔ مانی انٹرو یوز میں مصروف تھا چونکہ وہ بے دھڑک ہر علاقے میں جا سکتا تھا اور لوگوں سے مل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ایلی کا خوف سدرہ اس تھا۔

یونہی چھ مہینے گزر گئے۔

### ریڈ یو پاکستان

اگست سنترالیس میں مانی کے پبلشر نے انہیں بلا بھیجا تا کہ وہ چند امور کا تصفیہ کر جائیں۔ اس بلاوے پر ایلی مسرور تھا چونکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ عالی سے ملے۔

اسے خیال تھا کہ عالی اس کی غیر حاضری پر متعجب ہو گا۔ سو چتا تھا کہ پہلے ابو چلا گیا۔ پھر امی چلی گئی اور ابو آ گیا۔ اور اب دونوں نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ مانی انٹرو یوز کے چکر میں ایسا پھنسا تھا کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ لا ہور جائے۔ اسے فلمی زندگی سے بے حد وچھپی تھی۔ فلمی ستاروں، ناقدوں اور فلمسازوں سے مل کر اس نے اپنی ایک حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس لئے مانی ایلی کے ساتھ لا ہور جانے پر رضا مند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایلی لا ہور جا کر بات چیت طے کر لے۔ جب تک وہ خود دیکھی میں کام جاری رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی لا ہور گیا۔

ابھی ایلی نے لا ہور یں قدم رکھا ہی تھا کہ لا ہور اور امر تسری کے درمیان آمد و رفت کا سلسہ منقطع ہو گیا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی۔ بسوں کا چلنامو قف ہو گیا۔ ایلی نے اس خبر کوں کر خصوصی پر پیشانی محسوس نہ کی۔ ہاجرہ عالی فرحت اور علی احمد کے کنبے کے تمام افراد علی پور میں محفوظ تھے اور علی پور محفوظ ترین مقام تھا ابتدہ لا ہور کے متعلق مسلمان پر پیشان تھے اور ریڈ ٹلف ایوارڈ کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔

لا ہور شہر میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ رات کے وقت گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتیں اور پھر موت کی سی خاموشی چھا جاتی۔ پھر کسی مجمع کا شور و نسل بلند ہوتا۔ لوگ چنگھاڑتے چلاتے چھختے اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ صبح سڑکوں پر یہاں وہاں لا شیں دکھائی دیتیں۔ انہیں دیکھ کر اپنے قدم را ہ گیر اور تیز کر دیتے تھے۔ سپاہی واردات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر منہ موڑ لیتے جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے بے تابی بڑھ رہی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی کہ ۱۲ اگست کا دن قریب آ رہا تھا۔ اس روز پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا اور ایوارڈ کا اعلان ہونے والا تھا۔

اس شام شہر پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار سنان پڑے تھے۔ مرد کیس ویران تھیں۔ لوگ گھروں میں سبھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بازاروں میں مسلح فوج ہاتھوں میں مشین گنیں لئے گھوم رہی تھی۔ مرد کوں پر فوجی ٹرک کھڑے تھے۔

ایلی ریڈ یوکھول کر بیٹھا تھا۔  
گھڑی نے بارہ بجاویئے۔ ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ بارہ بجے اعلان ہونے والا تھا۔

آج وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اعلان اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہو۔ جیسے اس کی قسمت کا نیسلہ ہونے والا ہو۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ مذہبی تعصباً سے بلند و بالا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ قیام پاکستان سے بے گانہ ہے۔ وہ ہندوستان اور عوام کی بہتری کے فلسفے کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بذات خود پاکستان ہے اور اس روز خود طے ہونے والیں تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ایک بادشاہ ہو اور پاکستان کے قیام کا اعلان دراصل اس کی رسم تاجپوشی کا اعلان تھا۔ اس روز اسے معلوم ہونا تھا کہ اس کی قلمرو کہاں سے کہاں تک ہوگی۔ لیکن وہ خوش نہ تھا۔ ایک ان جانی ادائی اور پریشانی اس پر مسلط تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کی قلمرو اسے مل جائے گی۔ وہ مضطرب تھا۔ بحد مضطرب۔

دفعتاً حاجی صاحب اس کے روپ و آنکھے ہوئے۔ ان کی گردن ہل رہی تھی۔  
”وقت آئت۔“ وہ مسکرائے۔ ”انشاء اللہ۔“ وہ بولے۔

پاک بابا چلانے لگا: ”وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ اسی کا کام ہے۔ وہی جانے۔ میں کون ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔“

پھر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔ ابھر رہی۔ ان کے پیچھے کنوں گڑگڑا رہا تھا۔ سفید چادر میں پیشی ہوئی مسجد سجدے میں پڑی تھی۔

رومی ٹوپی والے نے مرد کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس

پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر و راز قدم نے آنکھیں بند کر لیں۔

”الحمد لله۔ الحمد لله۔“ مدھم سی سرگوشی ابھری۔

ریڈ یونے مہر سکوت توڑ دی۔

طبل بجھنے لگا۔

جیسے دور بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔

وہ مدھم دھڑکن قریب آ رہی تھی۔ اور قریب۔ اور قریب۔

”ہم ریڈ یو پاکستان سے بول رہے ہیں۔“

اعلان ایلی کے بند بند میں گونجا۔

پھر دھڑکن بن کر اس کے دل کی گمراہیوں میں لگا گیا۔ اس کا سر بھن سے اڑ گیا۔

جیسے کسی نے بارو دکھا دی ہو۔

پھر اس کے بدن پر چیزوں نے رینگ رہے تھے۔ چیزوں نے اسی چیزوں نے۔

پھر کسی نے اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔

”پاکستان زندہ باد۔“ کوئی چلا یا۔

اسکے روپ و دنیا بھر کے مسلمان قطاووں میں کھڑے تھے اور ہر مسلمان کے سر پر تاج تھا۔

## عالیٰ عالیٰ

اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ ضلع گوردا سپور ہندوستان میں شامل ہو گیا تو اس کا دل دھک رہا گیا۔

اسے یقین نہ آتا تھا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟“ وہ آپ ہی آپ چلا رہا تھا۔

”نہیں نہیں۔ نہیں ہو سکتا۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟“

پھر وہ باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں دکانوں پر کھڑے لوگ گوردا سپور، گوردا سپور چلا رہے تھے۔

نکڑ پر حلوائی دودھ کے کڑا ہے میں چچپے ہلاتے ہوئے آپ ہی آپ گلندا رہا  
تھا: ”بھائی جی \_\_\_\_\_ گور داسپور کیا ہوگا؟“

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے جارہا تھا۔

”بھوں بھوں۔“ کارچن رہی تھی۔ وہ رُک گیا۔

”کیوں جی۔“ اُرایشور نے سر نکالا۔ ”گور داسپور کا کیا بنا۔“

”کیا بنا۔“ ایلی نے دہرایا۔

”وہاں میرے بچے ہیں۔“ اُرایشور نے ایک عجیب سی نگاہ سے اس کی طرف  
دیکھا۔

کارچل پڑی۔ اس کے چچپے عالی بیٹھا تھا۔ ”ابو۔ ابو۔“ وہ ہاتھا تھا رورہا تھا۔

”ابو۔ ابو۔“ پھر بہت سے لوگ اس کے گرواؤ کھڑے ہوئے۔

”کون ہے تو بابو۔“ وہ چلائے۔ وہ غنڈے تھے۔

ایلی نے چونک کران کی طرف دیکھا۔

”کہاں جا رہا ہے تو؟“ وہ اسے گھورنے لگے۔

”علی پور۔“ وہ بولا۔ ”وہاں میرا بچہ ہے۔ میری ماں ہے۔ میری بھی ہیں۔“

وہ پیچھے ہٹ گئے۔

”پیدل جائے گا۔“ ایک لڑکا چلایا۔

”اے ہٹ جا۔“ کس نے رُخ سے رُک کے کے منہ پر تھپٹر مارا۔ ”جائے  
وے۔“ ”غنڈہ چلائی۔“

ریلوے شیشن ویران پڑا تھا۔ چند ایک لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھے اونگھرہ ہے تھے۔ دیر  
تک وہاں گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔

پھر دلتا اسے خیال آیا۔ ”بایو جی بایو جی۔“ وہ وردی والے بایو کو دیکھ کر بولا۔ ”بایو  
جو جی بایو جی۔ امر تر کو گاڑی جائے گی کیا۔“

بابو کگیا اور چونکے ہوئے انداز سے بولا: گاڑی؟“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔ ”امر تر گاڑی جائے گی کیا؟“

”اوہ۔“ بابو چونک کر بولا۔ ”مطلوب ہے گاڑی۔“

”جی ہاں۔“ ایلی بولا۔ ”امر تر کو۔“

اس نے گلی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں جائے گی۔“

”نہیں جائے گی؟“

بابو نے سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں تم تھیں۔

دروز وہ ریلوے شیشن اور بسوں کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ بسوں والے اس کے سوال کا جواب نہیں دیتے تھے کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔

”میں تمہیں کرایہ دوں گا۔ جو مانگو گے دوں گا۔“ وہ چلاتا۔

وہ اس کی طرف ٹکلکلی باندہ کر دیکھتے اور سر ہلاتے۔

بوں کے اڑے سے وہ پھر شیشن پر جا پہنچا۔

حتیٰ کہ ایک روز گاڑی آگئی۔

”یہ گاڑی امر تر جائے گی۔“ وہ چلایا۔

”بابو غور سے اس کی طرف دیکھا۔“ ”یہ امر تر سے آتی ہے۔“

”کیا یہ واپس جائے گی؟“ وہ چلایا۔

بابو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جا کر دیکھ لو۔“

ایلی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شاید گاردا سے بتا سکے۔

وہ ڈبے کی طرف لپکا۔

ڈبے میں چاروں طرف خون کے چھینٹے لگے ہوئے تھے۔ سرخ گھڑیاں ادھر ادھر پڑی تھیں۔

ایلی کی چیخ نکل گئی۔

”یہ گاڑی امر تر سے آئی ہے۔ یہ گاڑی امر تر سے آئی ہے۔“ چاروں طرف شور مج گیا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگا جا رہا تھا۔  
پھر اسے معلوم ہوا کہ علی پور ٹرک لے جانے کے لئے اسے دفتر پر مٹ حاصل کرنا  
ہے۔

جب وہ پر مٹ دفتر پہنچا تو وہاں بہت بھیز تھی۔ لوگ دیوانہ وار دفتر کے گرد گھوم رہے تھے۔  
سارا دن وہ وہاں گھومتا رہا لیکن کسی نے اسی کی بات نہ سئی۔ جب دفتر بند ہو گا تو وہ  
ایک بابو کے سامنے چلا نے لگا۔  
”پر مٹ لینا ہے؟“ بابو نے پوچھا۔  
”جی۔“

”کہاں کا؟“

”جی علی پور کا۔“

”ہوں۔ ٹرک ہے تمہارے پاس۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

بابو قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تو پر مٹ کس کا لوگے؟“

”لیکن \_\_\_\_\_“ ایلی بولا۔

”بھائی صاحب۔“ بابو کہنے لگا۔ ”پہلے ایک ٹرک حاصل کرو جو ادھر جانے کے  
لئے تیار ہو۔ پھر یہاں آ کر پر مٹ لو۔ اور علی پور لے جاؤ۔ ایسے غم نہ کھاؤ۔ علی پور  
ابھی تک محفوظ ہے۔“

پھر کئی ایک دن وہ ٹرکوں کے پیچھے گھومتا رہا۔ ادھر جانے کے لئے کوئی ٹرک رضا  
مند نہ ہوتا تھا۔

”بھائی صاحب۔ امرتسر کی طرف جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ سالے ٹرک کو آگ لگادیتے ہیں وہاں امرتسر میں تو خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔“ آکر اسے ایک ٹرک مل گیا۔

”دیکھو بابو۔“ ٹرک والا بولا۔ ”جتنے دن کھڑا ہے سورپیچی فی روز ہو گا اور جس روز پرمث مل گیا دوسو جانے کا اور دوسو آنے کا یعنی چار سو لگا۔“ ایسی نے محضوں کیا پرمث حاصل کرنے سے پہلے اسے سورپیچی کا انظام کرنا ہے۔ لاہور میں اس کے گرد وحشت ناک مناظر تھے۔ مکانات جل بڑھتے تھے۔ سڑکوں پر خون کے چھینٹے پڑتے ہوئے تھے۔ لوگ گھٹریاں اٹھائے ہوئے آرہے تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ امرتسر سے آئے ہوئے لاگ اشتعال بھرے نعرے لگا رہے تھے لیکن وہ ان مناظر سے بیگانہ تھا۔ اس کی آنکھوں تکے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ ہاجرد کے چہرے کی جھریلوں پر آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے تھے۔

صحح سوریے وہ مٹ کے دفتر میں جا پہنچا۔ سارا دن وہاں وہکے کھاتا اور پھر جب دفتر بند ہو جاتا تو ٹرک والے کے لئے سورپیچی اکٹھا کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگ جاتا۔

چھومن گزر گئے۔ وہ ٹرک والے چھو سورپیچی اوکر چکا تھا۔ اب اس پر مایوسی اور نا امیدی چھا چکی تھی۔ پرمث دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھا کہ واپسی بلک رہا تھا۔

## ہولڈ آپ

پھر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ سامنے شیر علی کھڑا تھا۔ ”آپ یہاں۔“ وہ بولا۔

اس نے شیر علی کو پہچان لیا۔ ”تم یہاں؟“ اس نے حیرت سے اس کی طرف

دیکھا۔

”میں یہاں ملازم ہوں۔“ وہ بولا۔

”اور وہ سب وہ \_\_\_\_\_ ایلی نے پوچھا۔

”وہ سب علی پور ہیں۔“ شیر علی بولا۔

”پرمٹ نہیں ملا۔“ ایلی نے مایوسی بھرے انداز سے کہا۔

”مجھے ایک ٹرک مل گیا ہے۔“ شیر علی بولا۔ ”آج ہی مکمل والوں نے دیا ہے۔“

”مل گیا ہے۔“ ایلی چالیسا سے اپنے کانون پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں مل گیا ہے۔ صرف ایک ہندو ق والہ سپاہی اور ایک ڈرائیور۔“

”اوہ \_\_\_\_\_ ایلی اجھے بیجا۔“

اسی روز وہ فوجی ٹرک میں بیٹھے علی پور جا رہے تھے۔

ٹرک کے پردے بند تھے۔ ڈرائیور گاڑے چلاتے ہوئے زیر لب قرآن کی آیات پڑھ رہا تھا۔ سپاہی نے ہندو ق کی نالی پردے سے باہر نکال رکھی تھی۔ اور وہ مرٹک کا جائزہ لے رہا تھا۔

شیر علی چپ چاپ ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ ایلی ٹرک کے اندر پچھلی سیٹ پر گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”اللہ اپنا فضل کرے۔“ ڈرائیور چلایا۔ ”بسم اللہ۔“ اس نے ایک سلیمانی کھولتے ہوئے کہا۔

”ہم امر تسریں داش ہو رہے ہیں۔ ڈرائیور سے کوئی باہر نہ جھانکے پردے کے پیچھے نہ بیٹھو۔ گولی سے بچاؤ نہ ہوگا۔“

”روکنا نہیں۔“ سپاہی بولا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو۔“

”روکنا۔“ ڈرائیور بولا۔ ”ہم چالیس کی سپید پر چلیں گے۔ چاہے کوئی بھی سامنے

ہو۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سپاہی بولا۔

ٹرک جھول رہا تھا۔ ریڑ کے گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔

دُور بہت سے لوگ چارہ ہے تھے نعرے مار رہے تھے۔ لمبی سمنی خیز چیزوں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وقت رینگ رہا تھا۔

دُلتا سپاہی چلایا۔ وہ دیکھو۔ ریل کی پٹری کے دونوں طرف حکموں کے جتنے ہیں۔

”وہ دیکھو۔“ وہ پھر چلایا۔ ”وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچے چھپے ہوئے ہیں۔“

”امد ہے ہو گئے ہیں لندھے۔“ ڈرائیور بولا۔ ”یہ سکھ۔“

”سر پر خون موارہ ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”لیکن ریل کی پٹری پر کیوں۔۔۔ ٹرک پر کیون نہیں۔“ شیر علی نے پوچھا۔  
”ضرور کوئی بات ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

پھر سپاہی اور ڈرائیور آپس میں با تین کر رہے تھے۔ شیر علی اور ایلی خاموش بیٹھے تھے۔

”لوچار میل رہ گیا علی پور۔“ ڈرائیور بولا۔

”چار میل۔“ سپاہی بولا۔ ”ذرارو کو۔“ وہ چلایا۔ ”روکو۔“

”پاگل ہو گئے ہو۔“ ڈرائیور بولا۔

سپاہی نے بندوق کی نالی ڈرائیور کی طرف پھیر دی۔ ”میں کہتا ہوں۔ روکو۔ ساتھ نے۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آواز تھرا رہی تھی۔ ”روکو۔“

گاڑک رک گئی۔ سپاہی نے بندق اٹھا اور باہر چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آیا جانا نہیں۔“ اور وہ بھاگتا ہوا درختوں میں فائدہ ہو گیا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے ایلی اور شیر علی کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے

تھے۔ ایلی کے ذہن میں وہی خلاکھول رہا تھا۔ وہ بھٹی بھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ عالی کی چینیں مددم پڑ چکی تھیں۔ اس کی شکل دھند لائی تھی۔ ہر چیز دھند لکا چھائے جا رہا تھا۔

”یہ تو سمجھو ہو لڈ آپ ہو گیا۔“ ڈرائیور بولا۔  
انہیں سمجھنے میں آرہا تھا کہ سپاہی انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کہاں چلا تھا تھا۔  
کہیں وہ سکھوں کے ساتھ تو نہیں مل گیا تھا۔ ان کو یوں بے یار و مدد دگار چھوڑ کر چلے  
جانا ایسی جگہ جہاں چاروں طرف دشمن تھے۔

”چلو اے چلو۔“ شیر علی نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اب تو علی پور بھی قریب ہے۔“  
”اوہ ہو۔“ ڈرائیور بولا۔ اس کو نہیں چھوڑ جائیں۔ وہ مسلمان ہے  
بھی۔ کیسے چھوڑ جائیں۔“

سامنے ایک ویران گاؤں تھا۔ گاؤں کے دو ایک مکان جلے ہوئے تھے۔ ان میں  
سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس کے اروگر دو کچھ سائے سے حرکت کر رہے تھے۔ دھغا ڈرائیور اٹھا۔ اس نے  
لوہے کی دو بڑی بڑی سلاخیں اٹھائیں۔

”یہ لو۔“ وہ بولا۔ ایک سلاخی ایک کے ہاتھ میں تھما دی۔ ”یہ لو یہ۔“ اس نے ایک  
کون کی طرف اشارہ کیا۔ ”اے پردے سے باہر نکال رکھو۔“

پھر اس نے دوسری سلاخ شیر علی کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ سمجھیں گے کے  
بندوقوں کی نالیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں پتہ چلے کہ ہم نہتے  
ہیں۔

”جو اللہ کو منظور ہو گا۔“ اس نے ٹرک کی جانی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی۔  
”انشا اللہ دو چار کو مار کر مریں گے۔“  
دیر تک وہ بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔

”وہ آرہے ہیں۔ خبردار۔“ ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ ”خاموش“

سامنے چار سکھ ہاتھوں میں لٹھاٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ڈک کے قریب آ کروہ رک گئے۔

”قریب آئیں تو گولی مار دو۔“ ڈرائیور چلا یا۔ گولی مار دو سار جنت۔ ”وہ چلا یا۔“ ایلی نے لوہے کی سلامخ کو اور باہر نکال دیا۔

”سار جنت۔“ ڈرائیور چیختے لگا۔ سنتے ہو سار جنت۔“

یہ سُنم کر سکھ بھاگ گئے۔ ڈرائیور یہ شنید۔ ”ایلی کی پیشانی پسینہ میں شر ابو حقی۔“

دھنٹا دور سے سپاہی کی آواز و سنائی دی۔ ”جگیا گریاں آگیا۔ اللہ اکبر۔“ اس نے نعرہ مارا۔ وہ بندوق اٹھائے بھاگا آرہا تھا۔ ”اللہ ہوا کبر۔“ اس کا نعرہ دوڑتک گونج رہا تھا۔ ”چلو چلو۔ شارت کرو۔“ وہ قریب آ کر بولا۔ وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔“

ڈک چل پڑا۔

”کیا بات تھی؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”گیا تھا روپورٹ کرنے۔“

”کہاں گیا تھا۔“

”بانڈری فورس کا ہیڈ کوارٹر ہے یہاں۔ وہاں گیا تھا۔“

”کہاں ہے ہیڈری کوارٹر۔“

”یہاں سے تین میل دور۔“ سپاہی نے کہا۔ ”وہ سامنے اس جھنڈے سے پرے۔“

”کیوں گئے تھے۔“

”میں نے سوچا۔ یہ سکھ جو ریل کی لائن پر کھڑے ہیں۔ ضرور فوجیوں کی گاڑی آنے والی ہے تو میں نے سوچا مسلمانوں کی ساری گاڑی کٹ جائے گی۔“

”تو پھر ل۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”پھر مجھے پتہ تھا کہ یہاں باندھی فورس فرنیشن فورس کی ہے۔ سب مسلمان ہیں اس لئے میں نے کہا۔ مہاجر گاڑی کو اللہ کے حکم سے بچاؤں گا۔ فورس کا صاحب انگریز ہے۔ میں نے سیلوٹ مارا۔ میں نے کہا حضور میں کی پڑھی پر فیوجی گاڑی کو سکھوں کے جھتے روک کر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔“

”گاڑی تو ابھی جلتی ہی نہیں۔“ ایلی بولا۔  
”تمہیں کیا معلوم بلایا۔“ چاہتی بولا۔ ”ایسا شکhta تو وہ سپاہی کیسے بھیجا جو یہ کہتا گاڑی آتے والی ہے تو کون منتامیری بات۔“

”تو پھر؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”صاحب ابھی سوچ رہا تھا کہ جوانوں نے سن لیا اور وہ حکم ملنے سے پہلے ہی فلیس لے کر بھاگے۔ وہ سب آرہے ہیں سکھوں نے جھتے بھاگ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو گاڑی فتح جائے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ ڈرائیور بولا۔

”اگر ہم پر یہاں حملہ ہو جاتا۔“ شیر علی نے پوچھا۔

”یہاں تو صرف تین مرتے۔“ سپاہی بولا۔ ”وہاں تو سینکڑوں کی بات تھی۔“

”اللہ مالک ہے۔“ ڈرائیور بولا۔

ایلی نے جیرانی سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ ”اور اگر تمہیں گولی مار دیتے تو؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک نہ ایک دن مرتا ہی ہے با یو۔ مار دیتے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اپنا کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن گولی سے ہی مرتا ہے۔ پروہ مسلمان رفیوجی کی گاڑی۔“ ”وہ

رک گیا۔

ایلی کی نگاہ سے گویا ایک پرده سامنہ گیا۔

عالیٰ پیچھے رک گیا۔

اس کی جگہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بچے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا ابو ابو۔ بیسیوں کی آوازیں بلند ہوتیں۔ سینکڑوں بوڑھی عورتیں اس کی طرف امید بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

### جاوہ جاؤ

انہوں نے محلے پر آخری نگاہ ڈالی۔

وہ آصفی محلے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔

محلہ ویران پڑا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دیواریں چھپاہ ایستادہ تھیں۔

محلے کا میدا خالی پڑا تھا۔ کچھ لوگ جا چکے تھے۔ کچھ اداں کھڑے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ محلے والوں کی زبانیں گویا تالوں سے چھٹ گئی تھیں۔ ان کی قوت گویاں آنکھوں میں دوب رہی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کے گھر ان کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ایلی نے آخری نگاہ ڈالی۔ اور پرچو بارے میں شہزاد کھڑی تھی۔ پھر وہ سب ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی احمد چپ چاپ سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے نہ جانے کدھر دیکھ رہے تھے۔

ہاجرہ کا چہرہ بھیا نک ہو رہا تھا۔ عالی حیرانی سے اوہڑا اوہڑ دیکھ رہا تھا۔ شیم اور اس کی بیٹیاں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ صرف راجو کے چہرے پر ہمت اور امید کی جھلک تھی۔ نصیر دانتوں میں تنکا چلا رہا تھا۔ رابعہ ہاتھ مل رہی تھی۔ فرحت کی ہوا یاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کے پچے سہے ہوئے بیٹھے تھے۔

ٹرک چلے جا رہا تھا۔

ریل کی ٹرک کے دور وی فوجی بندوقیں لئے کھڑے تھے۔  
وَعَتَّا سَبَّاً چلا: ”اللَّهُ أَكْبَرٌ۔“

سب سپاہی کی طرف دیکھنے لگے۔

”رفیوجی گاڑی۔ رفیوجی گاڑی ہی۔“ وہ پچوں کی طرح تالیاں بجارتا تھا۔  
انہوں نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔

سامنے ریل کی ہٹوئی پر مسلمانوں کی پہلی رفیوجی گاڑی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ  
لوگ یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے کہ پر چیونیاں وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے اس  
عظیم ابو جھہ تلے ہو تک رہی ہو۔  
”اور گرایاں۔“ سپاہی چلانے کا کام ”آن آئسٹ کا آخری دن ہے۔“

ڈرائیور نے سپاہی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر وہ بولا:

”کل مسلمان باندری فورس یہاں چلی جائے گی۔“  
”چلی جائے گی۔“ علی احمد بولے۔

”اور اور۔“ ڈرائیور بولا۔ ”چلی جائے گی تو۔

”سکھ دھاندی مجاویں گے۔“ سپاہی نے جواب دیا۔

”اور علی پور کا کیا بنے گا؟“

”وہ تو باندری والوں کی وجہ سے بچا ہوا تھا۔“ سپاہی بولا۔

”گروپن تو صاف ہو گیا۔“ ڈرائیور نے کہا۔

ایلی نے جھر جھری لی۔

ایک بھی انک خاموشی چھا گئی۔

”ارے بھائی۔“ ڈرائیور نے ایک چینی ماری۔

سبھی ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگے۔

ٹرک رک گیا۔

وہ سب کم گئے۔ شاید حملہ ہو گیا۔ شاید ڈرک خراب ہو گیا۔

سپاہی نے عیل کافرہ مارا اور بندوق اٹھائے باہر چلانگ لگا دی۔

وہ پردے ہٹا کر دیکھنے لگے۔

سرک پر یہاں وہاں لاشیں پڑی تھیں چاروں طرف خون کے چھینٹے اڑے ہوئے تھے۔ اور ان کے درمیان پاگ بابا چھاتی نکالے گروں اٹھائے بے پرواں اور بے نیازی سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر یوں ہل رہا تھا جیسے جہاڑا کا کپتان اردوگرد کا جائزہ لے رہا ہوا اور جہاڑا کے ملا جوں کو احکامات جاری کر رہا ہو۔

”بابا۔“ ڈرائیور چلایا۔

سپاہی بابا کو دیکھ کر بھوپھو کار بنا کیا۔

”بابا۔“ ڈرائیور پھر چلایا۔

بابا دورت جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔

”آؤ باؤ چلیں۔“ سپاہی چلایا۔ ”پاکستان چلیں۔“

بابا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔ ”چلیں۔“ وہ بولا۔ ”سب نے چلے جانا ہے۔

سب نے۔ ہاں تو جاؤ۔ جانا ہے تو جاؤ۔ جس نے جانا ہے جائے۔“

”تم آ جاؤ بابا۔“ ڈرائیور چلایا۔

بابا اپنی ہی دھن میں چلا رہا تھا: ”جانا ہے تو جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ وہی مارتا ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے۔“

”لیکن بابا۔“ سپاہی چلایا۔ ”وہ تمہیں مار دیں گے۔“

”مار دیں گے۔“ ”بaba کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔“ ”وہاں کہاں ہیں۔ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں وہ۔ کوئی بھی تو نہیں صرف وہی ہے۔ صرف وہی۔ یہاں وہاں ہر جگہ ہر جگہ اور کون ہے؟“

”اے زبردستی اٹھالو۔“ ڈرائیور چھینخنے لگا۔ ”اٹھا لوڑک میں ڈال دو۔“

بابا نے ایک غصب ناک نگاہ سپاہی پر دالی۔

”مت کرو۔ مت کرو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”بابا کو کچھ نہ کہو۔“

بابا نے ایلی کی طرف دیکھا۔ ایلی نے جھک کر سلام کیا۔

## حضور حضور

بابا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ٹرک کے قریب آکھڑا ہوا:

”بولو کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلا یا۔ ”صب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کہاں کہاں حفاظت نہیں کی۔ کہاں کہاں خیال نہیں رکھا۔ کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔ بولو بتاؤ۔“

”وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے۔“ وہ پھر بولنے لگا۔ ”جاو جاؤ تم جاتے کیوں نہیں۔ وقت آگیا۔“ وہ روبرو جاؤ جاؤ۔ مسجد کے پاس کنوں کے پاس دونوں بیٹھے ہیں۔ اللہ نے معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا وہ جس کے ہاتھ میں چاہے دیدے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں وہ جانے اور وہ جانے۔ وہ دینے والا وہ لینے والا۔ جاؤ جاؤ۔“

دراویر نے ٹرک مثارٹ کر دیا۔ سپاہی پھر کراو پر چڑھ گیا۔

”جاو۔ بابا۔“ سپاہی آخری مرتبہ چلا یا۔

بابا نے قریب ہی سے ایک لاٹھی اٹھائی اور دوسرا طرف منہ پھیر کر اسے لمبرانے لگا۔

”مہٹ جاؤ۔“ مہٹ جاؤ۔ اور پھر لاٹھی پھینک کر ہٹنے لگا۔ ”مجھے کیا ہے مجھے کیا ہے کرنے والے تم ہو۔ تم جانو۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں“ وہ چلا رہا تھا۔ ٹرک روانہ ہو چکا تھا۔

دفعتا ایلی کے روپ و حاجی صاحب آکھڑے ہوئے۔ ”وقت آئے گا۔ وقت آئے گا۔“ وہ مسکرائے۔ ”الحمد للہ۔ اللہ اچھا کرے گا۔ وقت آئے گا۔“

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی: ”میں رکاوٹ تھی۔ میں درد ہو گئی۔ میں درد ہو گئی۔“

دلی کا عالم مولوی نہس رہا تھا۔ ”سب اس کا پرتو ہے۔ سب اس کی شعبدہ بازی ہے۔ وہ بڑا شعبدہ باز ہے۔ سب اسی کا کھیل ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔“ وہ ہٹنے لگا۔

”خبردار۔“ ڈرائیور چلا یا۔ امر تر آگیا۔ کوئی باہر نہ جھانکے۔ کوئی آواز نہ نکالے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سپاہی بولا۔

ایلی چونک پڑا۔

اس نے سامنے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔

سامنے چوک میں ایک فوجی ہڑا تھا۔

”اگر اس نے روکا۔“ سپاہی بولا۔ ”تو رکنا نہیں۔“

”جو اللہ کرے۔“ ڈرائیور نے ٹرک تیز کر دیا۔

چوک میں کھڑے فوجی نے رکنے کا اشارہ کر دیا۔

”جاو جاؤ۔“ دور سے پاگ بابا کی آواز سنائی دی۔

”ترٹاخ۔“ ایک آوازی سنائی دی۔

چوک میں کھڑا فوجی ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ایلی نے ہڑ کتے ہوئے دل سے سامنے دیکھا۔

”جاو جاؤ۔ چکو میں۔“ پاگ بابا چلا رہا تھا۔ ”ترک سے نہیں۔ کھیتوں سے۔ کھیتوں سے۔“

ڈرائیور نے ٹرک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا۔

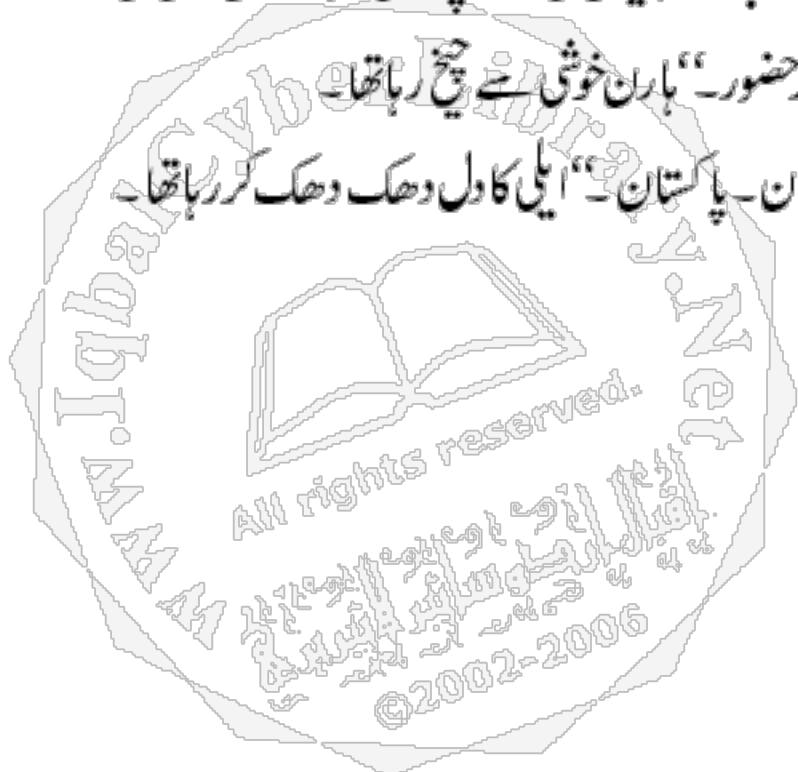
”نیا جیون۔ نیا جیون۔“ کھڑکی میں شہرا و گنگاری تھی۔

”آنے دو۔“ رومی لوپی والا کھیتوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔

”راتستے کی رکاوٹ تو میں تھی۔“ شہرا و۔

”آنے دو۔ آنے دو۔“ دراز قد اشارے کر رہا تھا۔  
ٹرک دوڑ رہا تھا۔ دوڑ رہا تھا۔

”آ جاؤ۔ جاؤ۔“ پہیوں کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔



# علی پور کا ایلی

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

”علی پور کا ایلی۔“ کے پہلے ایڈیشن کی ہر جلد کے ساتھ ایک چیپی لگلی ہوئی ملتی تھی۔ جس پر لکھا ہوتا تھا۔ ”اے آدم جی انعام بھی ملا۔“ اور پچھلی عرصہ بعد اس کے باہت امん انشا، صاحب نے کہا۔ ”اسی لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا۔“ اور جملہ کا یہ حصہ اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گیا ضرور ملے گا۔ مگر انعام ”تلائش بہاراں۔“ کو دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں بیباک تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتناؤ نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام ”خدا کی بستی۔“ کو دیا گیا تو میں نے مولی صاحب سے کہا تھا۔ ”آپ نے ترازوہ سے توں کر انعام دیا ہے۔“ اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔ ”آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے۔“ مولوی صاحب نہ دیئے تھے۔ پھر آئندہ سال ”تلائش بہاراں۔“ کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا۔ وہ قریب المرگ تھے۔ مگر باقیں کرتے تھے میں نہ کہا۔ ”آپ کی انعام دینے کے سلسلہ میں ”علی پور کا ایلی۔“ اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازوہ ہی ٹوٹ گئی لہذا اس کا وزن نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب ”تلائش بہارا۔“ کو آپ نے انعام دے دیا۔ مولوی صاحب حجودی دیر کے بعد غش میں آ جاتے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے یہ بات پوری سنی یا نہیں ملگ میں یہ سب ہی سے کہتا رہا۔ یہ عجیب واقعہ تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی تعریف یہ ہو کہ ”اے آدم جی انعام ملا۔“ اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ اے ”آدم جی انعام نہیں ملا۔“ انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک حد تک

جن ناولوں کے باہت یہ کہا جائے کہ انہیں انعام ملایا نہیں ملا وہ بھی بے معنی ہو گئیں۔ اس بنابر ”مجھے علی پور کا ایلی۔“ سے ایک حجم ساتھ ہو گیا اور میں اسے بھی ایسی چیز ماننے لگا جو میرے پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس تعصب کو ختم ہوئے بھی عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن جمیل صاحب کے بیان اس کا وہ ایڈیشن رکھا ہوا دیکھا جو ”ہماری لاہوری ی۔“ کے سلسلہ کا ہے۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری سے بھی بہت ہی واقف تھا۔ اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ طے کیا کہ ”علی پور کا ایلی۔“ کو ضرور پڑھ کر دیکھوں گا اور جمیل صاحب سے کتاب بھارتیا لے لی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس میں اینا محو ہوا کہ دن دون بھر اور رات میں کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ ساتھ لئے لئے پھر اول راجی کی بسوں میں دفتر وہ میں جہاں بھی ذرا سا وقت مل گیا۔ اس کی طرف رجوع ہو گیا کتاب ضغط تھی اور جلد پھر بیک جب میں نے اسے جمیل صاحب کو واپس دیا تو اس کے بلا مبالغہ آٹھ الگ الگ ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر تعجب سے یہ بھی کہا۔ ”اتنی موٹی کتاب پڑھ رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چھوٹی یا موٹی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں یہ کتاب حد سے زیادہ ولچپ ہے اور میرے لئے میں غیر ادبی یا ادب سے گری ہوئی کتاب نہیں پڑھتا اور یہ مجھے آج کی سب ادبی کتابوں سے زیادہ ولچپ معلوم ہو رہی ہے جلد سے جلد ختم ہو جائے گی۔“ غرض اس کتاب کو ایک ہلکی قسم کی نفرت سے میں نے شروع کیا مگر یہ میرے لئے ولچپ اور قابل وقعت ہوتی گئی اور آخر میں اس مشل پر وری اتری کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ مشقق محمد طفیل ایڈیٹر ”نقوش“ نے اس کا ”فسانہ آزاد۔“ سے مقابلہ کیا اور ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ”علی پور کا ایلی۔“ اور ”فسانہ آزاد۔“ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آخر الذکر ناول کے میدان میں پہلا ڈمگا تا ہوا قدم ہے اول الذکر اس میدان کے ادب میں پورے طور پر تحریر کا نشان ہے۔ ”نہیں نے کہا۔“ اس پر ایک مفصل مضمون لکھ

ڈالئے۔ میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقش سو گیا ہے۔ مجھے بھی نیند آگئی اور وہ رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے میں نے اسے پھر پڑھا اس پر مضمون لکھ دالنے ہی کا فیصلہ کیا۔ نقش نہ معلوم کب نکلے گا مگر مضمون کو تیار رہنا چاہیے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پر مفصل لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۳۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ناول نگاری میں ایک نیا بلکہ ناول کے اصل معنوں میں پہلے دور کے نقش بجا رہی ہیں میری رائے ہے کہ ”علی پور کا ایلی۔“ ان آدھے درجن ناولوں میں ہے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔ ممتاز مفتی صاحب ناول کا واضح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ انعام تھ بیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے۔ جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے باہت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انگسار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

”اپنی دانست میں میں نے ناول بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقاء پیش کروں۔ اس لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گرینہ نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈنکیاں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پسچھی کی طرح پر جھاؤ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔“

بہر حال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی۔ جس کی تفصیلات برآ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چنانوں کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بنتی ہے۔

(پیش لفظ، طبع ثانی)

پیش لفظ طبع ۱۹۶۱ء میں وہ پہلے ہی فرم اچھے تھے۔

یہ رومنداز ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا عالم پچھنہ بکار رکھی۔

جس نے تجربے سے پچھنہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے جنبی رہے۔

جو پلا پروان چڑھا اور باب پ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک مجسم کیں لیکن محبت نہ کر سکا۔ جس نے محبت کی پھل بھڑیاں اپنی انا کی تسلیم کیں پسروں کے غصیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جو  
الانہ پیدا کر سکا۔

جوز نمدگی بر اپنی انا کی وضدی بھول بھیوں میں کھویا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چکی اور اسے نہ جانے کہاں کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان پیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گرینز کی وجہ میرا عجز ہے اور ان کی کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو پھرہانے کی کوشش کی ہے۔“

ظاہر ہے کہ دو پیش لفظوں میں جو کچھ نہیں ملتا ہے اس باقاعدہ تقید ہی کہا جا سکتا مگر وہ ممتاز مفتی ساحب کے ناول کے سلسلے میں شعور کا ضرور اندمازہ دیتا ہے اور اس میں سے حسب ذیل خاصی باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ مستقل واقعیت پسند ہیں۔ وہ اپنا مخصوص تجربہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ وہ بالکل صحیح رہے۔ یہ بات ہمیں ناول کی بنیاد تک لے جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ناول کی ابتداء کرنے والوں کے سامنے بھی یہی مخصوص مقصد تھا

اور یہی مقصد آج بھی تمام ادبی ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اس مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا زندگی کے حالات کو نظر یا چیخیل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے ناول نگار منظر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اور ناول متاثر کرنے کے علاوہ ذہنی کاموں و بہم پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جنگجوی میں نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک رونداو کے بے کم و کاست بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب رہا ہے۔ ابتداء کے ناول نگار سے فساد سمجھ کر بہت سے فرضی خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے رہے اور آپ کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل کر ہوئے ہوئے۔ اس لئے ہمارے یہاں ایسی ناول ہے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈھنے نہیں ملتے۔ مفتی صاحب اس فارم اس ”خالص ناول۔“ کی راہ پر چل رہے ہیں اور ”علی پور کا ایلی،“ اپنے نام سے ہی اور پھر مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی واقعیت پسندوں اور قدریت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور قدم میں غریش نہ آنا۔ بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہمکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں دو خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فرخ دلی سے پیدا ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگاتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چلنے کی کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج انتخاب اور ارتفع کے اصولوں کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور بہت سی سکڑا کر رکھی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ناول نگار اور صاحب ذوق دونوں کی

تخیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بنتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے بہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے اور بیشتر لوگ بہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر لوگ اسے اپنی طرح پر سمجھتے ہوئے اسے پڑھ جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور ہر اس معاملے میں بھی وہ انعامیوں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ ہیں جو تفصیلات کو زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے۔ اور زندگی کا واسع سے واضح نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس لئے ”علی پور کا یالی“ میں ہمیں جدید فنکاری سے انکار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانے طریقے اب بھی کتنا زور دار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وجہ سے اس کی خمامت بڑھ گئی ہے۔ جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظر یہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا ہو مگر زیادہ تر لوگ خمامت ٹھہر جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حدحد چار سو صفحوں کی ہو۔ ”علی پور کا یالی“ کی خمامت زیادہ تر لوگوں پر بارے ہے۔ میں اسے ایک قسم کی بد نمائی سمجھتا ہوں اصل میں خمامت مواد اور فن پر مبنی ہوتی ہے اور مفتی صاحب کا جو مواد ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی خمامت گھیرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچ سمجھے روائی کے ساتھ ناول سرسراتے گئے ہیں اور انہیں فنکاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور طوالت کیا محض لاپرواہی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقبل فتنی صورت چھپی ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک ڈکش ہے۔

تمیرے یہ کہ تخلیق کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو اور اسی کی حد سے زیادہ نارمل نوعیت کو دانگی حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول نگاری کے سلسلے میں بھی با غمی ہے۔ اور

بالکل واقعاتی کردار پیش کرنے کے بجائے اشاریت وغیرہ عمل کرتی ہے۔ مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو ”دون کا ہوئے۔“ سے شروع ہو کر ”پکوک پیپر ز۔“ تک چلی آتی ہے اور آج بھی سورست مامم وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معااملے میں بھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاؤں کو الگ کر دیتے ہیں۔ خنامت اور سمعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا بھرنا اور نئے نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے۔ پھر ناول کا مرکز میں کردار ایلی سب سے زیادہ مختلف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے باہت چند بنیادی باتیں وہ پیش کی جائیں ہوئے دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اس مثل کی صداقت ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کی ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی باکمال آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی باکمال سے وابستہ ہونا چاہئے اور اگر ایلی دنیا نے ناول نگاری کے ان کردار میں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیق اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضرور ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیاد روح یا سیدھی ضرور را سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری آلات کشوں سے پاک ہے جو تجربہ کی طرح تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش لفظوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جب کی رائے کو کوئی خاص و قوت نہیں دینا چاہئے۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور ”علی پور کا ایلی۔“ میں بس اسی حد تک ہے جتنا کہ ایلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو رنگ دینا واقعیت سے غداری کے مترادف ہوتا اس لئے مفتی

صاحب نے رومانی رنگ چڑھانے سے گریز کیا۔ اس لئے عام ناولوں کو پڑھنے والے اسے غیر دلچسپ کہیں گے۔ مگر میں نے پڑھ کر دیکھا ہے اور بہت سے لوگ میرے ہم رائے ہیں کہ اس میں بے پناہ دلچسپی ہے۔ ویسی دلچسپی بھی جیسی ناول کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ڈھونڈھتے ہیں اور ویسی دلچسپی بھی جو جیسی ایک فرد کے دنیا سے کٹکش سے خاص طور پر عشق بازی کی کش کمش سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں ایک مسلسل عشقی قصہ بھی ہے۔ جو بڑے جز بیکات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اور بڑے دلکش کردار کے مختلف پہلوؤں کھاتا ہے۔ ایلی اور شہزادکا عشق بڑی عجیب حقیقت ہونے کی وجہ سے اچھا خاصار و مانی ہے اور اس میں زخموں کو اور اس کے نتیجوں کو ہم بڑی دلچسپی سے نکلتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ لاہور میں ایلی کا ایک اور عشق چلتا ہے اور وہ بھی دلچسپ ہو جاتا ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنی جگہ پر عجیب ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ ایلی کی شہزادکی طرف توجہ کو ختم نہیں کرتا پھر جب ہمیں یہی سے شروع ہی سے دلچسپی ہو جاتی ہے کہ ہم اسے ناول کے سلسلہ کے تعصبات سے ڈھون کو خالی کر کے پڑھیں تو زندگی کا جو منظر یہ پیش کرتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔ اور ضحامت اور دلچسپی کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہوگی بلکہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ یہ اور بھی خیم ہوتی تو اچھا تھا۔

(۲)

مفتش صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں زندگی کی تفصیلات ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہیں۔ ڈھیر کا لفظ (بتر تجھی کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر کسی ڈھیر پر غور کیجئے تو اس میں ایک ترتیب ضرور نظر آئے گی۔ یہ ترتیب انسان کی دی ہوتی تو کسی طرح نہ ہو گی مگر قدرت نے انسان کے ڈھیر کئے ہوئے مواد سے ایک ترتیب ضرور پیدا کر دی ہو گی۔ اناج کے ڈھیر کو دیکھنے اس کی ایک چوٹی ہو گی اور سارا مواد اس سے شروع ہو کر ایک مشتمل کی شکل ضرور اختیار کر گیا ہو گا۔ ”علی پور کا ایلی“، بھی اسی قسم

کی ترتیب قدرتی ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی ابتداء میلی یا الیاس کے گھر کا سین سب میں پہلے سامنے لاتا ہے۔ باپ علی احمد دو ماہیں ایک سگی ماں ہاجرہ اور ایک سوتیلی صفیہ صاف صاف ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ منفرد ہیں۔ ایلی کو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص رد عمل رکھتا ہے۔ علی احمد مستقل کردار ہے۔ وہ ایلی کو ملازم کی طرح سمجھتے ہیں اور ایلی ان کی آواز ن کر دھک سے رہ جاتا ہے۔ اور ان کا حقہ بھرنے لگ جاتا ہے۔ ہاجرہ بھی ایک ملازم کی طرح ہے جو قناعت اور رواوداری سے زندگی کر رہی ہے اور وضع دار اور حسین صفیہ کے حکم پر چل رہی ہے ایلی صفیہ سے نفرت کرتا ہے اور کھن کھاتا ہے۔ علاس کے حکم پر چلنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ ما جوں پورے طور پر بھارتے سامنے آ جاتا ہے۔ جو ایلی کے کردار کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ ناول کی یوں ابتداء بڑی معنے خیز اور فتنی لحاظ سے بڑی مناسب ہے۔ علی احمد اور ایلی جو تمام داستان پر حاوی رہیں گے پوری افرادیت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں اور ایلی کا عورتوں کی طرف رد عمل جو داستان کی بنیادی چیز ہو گا پورے طور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہاجرہ کو وہ ہیر و ن اور صفیہ کو وہن سمجھتا ہے اور علی احمد کے ہر حکم پر چلنے کو تیار ہے۔ علی احمد اس سے محبت کرتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت گوشت کی بوٹی اسے دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دینا ایسا پیار ہے جو ثابت کرتا ہے کہ علی احمد کا خاص رجحان تو اپنے کام کی طرف ہے یا پھر عورتوں سے تعلق پیدا کرنے میں ہے مگر وہ ایلی کی طرف باپ کے فرائض اور باپ کی محبت کے تقاضے پورے کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ بہر حال ابتداء ایک فوکس ہے جس میں ساری ناول دکھائی دے گئی ہے اور اس سے علی پور کی طرف گریز اور اس کا مناسب بیان نہایت قدرتی ہے۔ اس کا ۲۰ صفحی محلہ ایک چھوٹی سی دلکش دنیا

ہے اور اس کے باعثاً اور ملکہ علیٰ احمد اور صفیہ کے نقوش اور بھی گھرے کر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آ جاتی ہے۔ صفیہ اور ہاجرہ کے آپس میں تعلقات انوکھا انتقام اور نرالا امتحان کے واقعات کے ذریعہ روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا باب ”مگر وہ پیش“، اسی برح مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر باب کی ایک سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو ما رجن میں چھپی نظر آتی ہے۔ ظاہریہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پر چھوٹی قاشیں کروئی گئی ہیں، مگر یہ سب قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت میں اور وہیان لگا رہنے میں خاص مد کرتا ہے۔ آتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر بھی نہیں بلکہ بڑے سائز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چورا اور اونچا ڈھیر ہے۔ اک پہاڑی کہنے مگر اس پر جانے کا راستہ پھر کا سہی ملک صاف ہے۔ ہر چوٹی اور موڑ پر نشان کے تختے لگے ہوئے ہیں اور سفر کرنے والے کی راہنمائی کرتے ہیں اور ہر ہر گوشے کی نوعیت کا علم بھم پہنچاتے ہیں۔ ”علی پور کا ایلی۔“ قدرتی طور پر ایک بے شکل پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ انج اور جدت کے ساتھ اس پر چلنے والے کے لئے ہر ہر قدم پر دلچسپ را ہیر کے فرائض ادا کئے ہیں۔ بے خیالی میں یہ مان لینا ممکن ہے ناول کا کوئی اسٹرکچر نہیں ہے مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے نظم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت درجنوں چھوٹے حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے انسان کے ذہن نشین کرنے اور مواد کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر مدد ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے۔ ناول زندگی کی طرح بے بیت ہے مگر اس پر مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے۔ یہ عام طور سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا مقتضاء ہے مگر غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا

شورزادے کے قابل ہے کہ ناول نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا مواد بھی وہ اسی خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور اچھوتی ہیئت کا اضافہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ہیئت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طول عمل ہو گا کہ تقید بھی کتاب کے برابر چھین ہو جائے گی۔ ہر چھوٹی سرثی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرثی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آ جانا دکھائی ہے۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا کردار بھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے۔ تفصیل سے ہر رہم دیکھتے ہیں تو علی الحمد یا ملی اور پچھا گے چل کر شہزادے کے قصے پلاٹوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی الحمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایسی غمغنا طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لکیر بناتا ہے۔ پھر ایسی اور شہزادے کے عجیب و غریب معاشقوں کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایسی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو علی پور سے باہر لے جاتا ہے۔ لاہور اور امرتسر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر اور امرتسر کوحد مان کر دائرے میں بلا یا جا سکتا ہے۔ ناول کا ماحول ہے۔ ایسی ولی اور بیمی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جہاں بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے کردار میں رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوصہ حصہ جسے علی پور کہتے ہیں۔ ایک واقعاتی مگر نئی اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے۔ اور مختلف بلکہ گونا گون قصوں اور کردار کو ایک اتحاد میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مواد میں ایک تختیل اتحاد صاف طور پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کی سرثی ”علی پور کا ایسی۔“ نہایت سادہ۔ نہایت سیدھی۔ سپاٹ اور اردو میں سرثی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے مگر یہ انگریزی اور یوروپی ناولوں کی

مرخیوں سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اور ان کی طرح بغیر کسی دکھاوے کے اول مواد کے ہر ہر جزو میں پرتوںی ہوتی نظر آتی ہے۔ اتحاد تاثر اسی سے شروع ہوتا ہے اور سارا مواد اس سے ابلى کر لکھتا ہوا اور تمام میں پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلی جو بیانوی طور پر علی پور ہی کا ہے ایک طرف علی احمد سے متعلق ہے اور ان کی تمام دلچسپیوں میں ایک مبصر کی طرح شریک ہے پھر اس کی اپنی بھی دلچسپیاں اور مصر و فیات ہیں۔ اسے تعلیم حاصل کرتا ہے اور ملازمت پر آتا ہے۔ اور اس سلطے میں وہ واقعات کا منفرد مرکز نظر آتا ہے۔ اس کا خامد انی گھر ہے اور اس میں اس کے عزیز ہیں۔ جن سے بھی اس کے تعلقات ہیں مگر اس کی سب سے خاص دلچسپی اپنے ایک عزیز کی بیوی اور اپنے سے کافی بڑی چھپوں والی شہزادے ہو جاتی ہے۔ شہزاد بھی اپنی جگہ پر بڑی دلکش اور زندہ دل عورت ہے اور ایلی کے اس عشق کا قصہ ہی مانا جاتا ہے اور عام ناول میں روایتی عشق کے واردات اور ایک معشوق کے لئے دو عاشقوں میں کشکش سے ہی سارے قسم کی تعمیر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کو جیسے کسی روایتی امر سے کوئی تعلق نہیں ہے ویسے روایتی عشق بازی بھی ان کے دائرے سے خارج ہے۔ ایلی اور شہزاد کے عشق میں ایک ہر بات حد سے زیادہ حقیقی ہے مگر ہم اسے بجا اور پر خلوص عشق ضرور کہیں گے۔ یہ عشق ناممکن بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور لوگوں کی نذر نظر میں بہت زیادہ مضجع بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی واقعیت میں ایسا زور اور ایسی عظمت ہے کہ ہم اس کے مظاہرے پر ایک عجیب تخلیقی دنیا میں کھوجاتے ہیں اور آخر میں اسی کو ناول کا حاصل اور ممتاز مفتی کا اہم ترین تجربہ مان لیتے ہیں۔ اس قسم کے مدارج بہت ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔ مگر ان میں سے بہت ہی خاص کا ذکر کر کے ہم اس کی اہمیت نوعیت اور جدت کا کچھ اندازہ لگاسکتے ہیں۔

ایلی کی زندگی میں شہزاد اس کے ایک قریب عزیز کی دلہن کی طرح داخل ہوتی ہے

اور علی پور کے ۲ صفحی محلہ کے سب سے خاص مکان یا محل میں آکر رہنے لگتی ہے۔ وہ ایلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھپجھوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں ہے شہزاد اس کی طرف ایسی توجہ دکھاتی ہے۔ جیسے کوئی چاہنے والی بھاونج چھپوئی دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آ جاتا ہے تو وہ پاک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ ایلی کے جنسی رجحان کو یہ کہہ کر دیکھتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ ایلی اس کی طرف آ کر پینگ پر پڑا رہتا ہے۔ اسے مشین چلاتے ہوئے پا اور کام کرتے ہوئے دیکھا رہتا ہے۔ اس کے بازوں پر ایلی کی خاص نظر رہتی ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو دیچمن سے۔ اس کی طرف آ جاتی ہے۔ اس بھم مگر و پچھپ محبت میں جنس داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سامان کی الگ کوثری میں ہے تو ایلی اس پر حملہ کر دیتا ہے مگرنا کامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن طے ہو جاتا ہے کہ ایلی شہزاد کو بھگالے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے۔ اور وکیل یہ سن کر کہ محبوہ چھپجھوں کی ماں ہے۔ ایلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل کو بہت کچھ دکھاتا ہے۔ شہزاد ایلی کے ذہن میں لس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں ”چمن سے۔“ آ جاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم کی غرض سے آ کر رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی اڑکی سے اس کی پینگ کافی بڑھتے ہیں۔ اس اڑکی کو سائیکل پر لئے ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آ جاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کی شادی ہو جائے مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزاد اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ ایلی کی ماں اس کی ایک جگہ منگنی کی رسم بھی پوری کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بھی ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

علی احمد جس کا خاص مشغله عورتوں سے لگاؤ کرتے رہنا ہے ایلی کو رنڈیوں سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور ایلی کو ایک رندی پھانس لینے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایلی خود بھی ایک دن ایک گندے رنڈی خانہ کی گندگی میں کو دھی پڑتا ہے۔ مگر آخر میں ایسا چھجھ ہوتا ہے کہ ایلی پنی تعلیم ختم کر کے اسکول کی ملازمت پر آتا ہے اور شہزادے اس کی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آجھے چل کر شہزادو کو اپنی پہلے شوہر کی لڑکی کی غلط شادی کی بنا پر ایلی کی توجہ اپنے شہزادے کے لڑکے عالی کی طرف رہتی ہے۔ وہ بسمیل میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب قسم ہند کے سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو ”عالی عالی۔“ کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت سی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شامل ہوتے رہتے ہیں۔ علی احمد کے ٹین کا پاہی بن کر متعدد معاشرے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ ایلی کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ضمناً ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے۔ ہر سلسلے میں ڈرامائی سینے بڑی مناسب اور موزوں مکالموں کے ساتھ سامنے آیا ہے ہیں۔ کتاب کی خیامت میں اضافہ رہتا ہے مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ کیا لفظ بھی بلا ضروری ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر فارم دیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد اہل فرد کو مختلف واقعات سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے مگر اس میں ڈرامائی ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھانے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجے طے ہوں۔ عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں بنتا ہے کہ یہ ناول زور کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علی پور اور اس

کا آصفی محلہ اور اس میں بھی ایلی کا خاندانی محل ایک سٹیج ہے اور اسی پر سارا قصہ دکھایا جا رہا ہے۔ امرت سر لا ہور اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمیم سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی سٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحاد ناٹر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر من قاری کے تصور میں جو ونیارہ جاتی ہے اس میں علی پور اس کے خاص قسم کے مکانات۔ آصفی محلہ اور اس کے خاص محل کے کے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تو تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب فنکارانی سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک دھیر کہہ دینے میں کوئی سکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کی ناول شاید لاشعوی اور قدیم طور پر مواد کو اس طرح سیمیت اور ایک مستقل شکل یا ہیئت میں تبدیل کر لی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ضخامت ڈراؤنے والی چیز ضرور ہے۔ اور بیشتر شخصیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم معنے سمجھتے ہیں۔ ”علی پور کا ایلی۔“ کاسر شارکے فسانہ آزاد سے مقابلہ کیا ہے۔ ”علی پور کا ایلی“ فسانہ آزاد کا ساجنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانہ آزاد ایسی بے تکان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک کڑ بڑ جھالے سے ایک دلکش تعمیر میں ارتقا کر کے پہنچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانہ آزاد کو اگر اس سے مقابلہ میں لا یا جا سکتا ہے تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے۔ ”علی پور کا ایلی۔“ کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھب گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان سرگزشت، دھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں۔ یعنی نقاوی حیثیت سے اس کی بابت ناول کا لفظ استعمال

کرنے سے پچھا نہیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ تقدیمی شکوہ سے بالاتر ہے۔ اور اس کی موج خرام نے گل کترے ہیں اور ایک بالکل نیا انفرادی اور دلکش چمن ایجاد کر دیا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا سکھان کے افسانوں ہی سے جم چکا تھا مگر ”علی پور کا ایلی۔“ اس کے بڑے پیانہ پر عمل اور کامیاب عمل کی مثال سامنے لاتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے سخت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہتا۔ ”علی پور کا ایلی۔“ میں ہر جگہ کردار امندہ تے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد اندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان بظاہر تین لافانی کردار کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہمکنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلے سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہی کی ہر دلچسپی مقرر ہو کر ایک خاص ٹھپکہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔ اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پر بیٹھے ڈیک پر رکھے ہوئے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ قمیض اتار کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ بھٹی ہوتی تھی اور اس کے پاؤں کو ادھرا دھر سکے رہنے کی عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں۔ ”ایلی حقہ بھر دو۔“ حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان کی ایک بیاناتہ بیوی ہا جرہ ایلی کی ماں ہیں۔ جواب مخفی نوکرانی

ہو کر رہ گئی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک بنی ٹھنی بیوی صفیہ ہیں جو زیادہ تر ان کے کمرے کی نیتیب رہتی ہیں۔ مگر صفیہ ان کے بے پنا جنسی رجحان کی ایک مثال ہے

”دوا کی وفات کے بعد علی احمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باجرہ کو ہمیشہ کے لئے آلو چھینے اور آٹا گوند ہٹنے پر مامور کر دیا اور خود کمرہ متباندھ کر اپنے جذبہ تغیر کو مطمئن کرنے چلی نظرے۔ وہ اپنی ایستادہ چال۔ ابھری ہوئی چھاتی۔ فراخ پیشائی اور رنگیں منبسم نکال ہوں۔ سے مروانہ وار تغیر کرتے پھر تخلیے میں دان کو بہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کا روزاری کی روشنی پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرنا تھا تھیک تھیک اگر ملادے کا۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورما ٹین کے سپاہی اور دو ووہ پیٹے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی اور چونکہ ان کا جنسی پہلو شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تاریخ پوچھا۔ ٹین کا سپاہی جنگجو سورما۔“

علی احمد اس صفت کے تمام تربندے ہونے کی وجہ سے یک طرفہ کردار یا کری کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ ایلی کے محبت دار باپ ہیں اور اس کی ترقی کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے اپنی حد تک اچھے خاصے منتظم بھی ہیں اور عام انسانی فرائض کی ادائیگی میں کوئی خاص کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر ان کا ٹین کے سپاہی والا پہلو ہی سامنے آتا رہتا ہے اور بڑی والہانہ دلچسپی کے ساتھ وہ عورتوں کی لمحت پر لمحت حاصل کرتے ہیں۔ ایسے ہیرو کی طرح مصروف نظر آئے ہیں۔ جس کا ایک اور ایک ہی مقصد حیات ہو۔ ان میں مجلسی زندگی کی جملہ صاحبیں بھی موجود تھیں۔ انہیں لکھنے سے عشق تھا عشق۔ یہ عشق گھر کا حساب اور پیدائش اور موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر مدد و دلخواہ۔ ایک جزل رجسٹر کے علاوہ وہ گھر سے متعلقہ ہر فرد کا ایک رجسٹر کھولے ہوئے تھے۔ پھر

ان کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تغیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محض تخيّل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوک چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلو دار (Round) کرنے کی مفتی صاحب کوشش کرتے ہیں اور نہیں یہ مخصوص لراویت ہیں کہ ان کی زندگی بے سب ہی انسانی پہلو میں اور ہرگز کرپچر نہیں کہے جاسکتے مگر ان کی جس زندگی کے مناظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک حفرہ دنیا اور نہایت درجہ درجہ پرچھ اور ان کے کردار کی تمام زندگی اس بات میں سمٹ آتی ہے۔ عورت دیکھتے ہی یہ ان کا پاہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تغیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کہہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر بھی ایسا کو داخل ہوتے ہوئے ہو اڑ لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت رحش پر علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے علاوہ کسی جسمی حرکت کے ہوتے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو ازاں میں رکھا سرم دنیا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو دون کوہنے کی طرح تغیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو ہر یہی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی خشم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایسا بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے۔ جیسے ڈون کوہنے کے سات سانگوپا ز امر دانیش کے یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنس کے مسٹر بکوک اور سام و میر تک ماحول کے حساب سے روپ بدلتے ہیں۔ مفتی صاحب کے وصیان میں بھی بھی وہ آفاقی اور وادی نام پ ہیں،

اور ”علی پور کا ایلی۔“ میں وہ علی احمد اور ایک کے ذریعہ نجات کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول ہے پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈون کھوٹے کی طرح اپنا بھالا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایلی سانگو پائزرا کی طرح اس کی بیداری سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھر یلوڑ کیاں جیسے سارا صبورہ و ضعداً زوجوں تینیں جو بیویاں بگر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کسیاں جو وہنی تعلق ہی کو کافی صحیح ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو کر لیتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیش اور ایلی کو اس کے لئے کنوں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے۔ سب ہی ان کے دامنے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تین چیز ہو جاتی ہے اور وہ اس سے جس طرح لطف لیتے ہیں اس کا منظر عجیب ہے وہ کھل کھلا کھل کھلا گاوٹ کی نہیں بنتے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ خیران کا وارخانی جاتا مگر ان کی جنسی فطرت ایسی خوبی سے سامنے آ جاتی ہے کہ جس کی مثال ملنانا ممکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزیات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں۔ خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے شیک سپہی نے فالٹاف کو پورے طور پر جمانے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پراٹر بنانے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں سرشار کا خوبی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وہ سے ہے کہ وہ ہزار و صفحوں پر بار بار آتا ہے۔ علی احمد خوبی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلو دار اور واقعاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضجع نمائندہ ہیں اور آفاقتی مزاح کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں ان سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو گلط نہ ہوگا۔

”علی پور کا ایلی۔“ کا کردار نگاری میں دوسرا ہم شایکار شہزاد ہے۔ یہ جوانی

اور زندہ ولی کی صورت ہے اور حسین عورت کی پیبا کی اس میں عجیب و غریب کرشمہ دکھاتی ہے۔ اس کا سب میں پہلے ذکر شریف سے اس کی شادی کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس نے شریف پر تھیلی میں بند مینڈک پھینکا شریف بیان کرتا ہے۔

واقعی وہ شہزادی ہے۔ اسے با منگی ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دلیزی سے باہر آگئی اور میرے روپر واس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔

---

اس نے مینڈک کو تھیلی میں ہی رکھا تھا اور جب میں سورہ تھاتو وہ تھیلی میرے منہ پر پھینک دی اور ڈر کر اسکے بیٹھا اور وہ ہنسنے لگی۔ اور پھر ایلی کی نگاہوں سے ایک شوخ حسینہ آکھڑی ہوتی اور پھر شادی میں رخصتی کے بعد ریل کے ڈبے میں ایک موںگیا گھڑی اسے دکھائی دیتی ہے۔

”موںگیا گھڑی میں جنمش ہوئی وہ سفید خون میں بھیکے ہوئے با تھا ایلی کی طرف لپکنے تازہ خون کی لوکا ایک ریلا آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ کہ گھڑی کے پٹ کھل گئے دو گلابی جھیلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ محنتی بیہ بہویاں ریگ رہی تھیں۔ اور بالآخر ایک چمکدار تبسم اور ایلی یوں کھڑا تھا جیسے [پتھر کا بن چکا ہو دبے کے دوسراے لوگ جعلما کر معدوم ہو چکے تھے۔

شہزادی کی کردار نگاری اس کے دوسراے لوگوں پر تاثر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آصفیہ محلہ میں آتے ہی وہ ہر شخص کے لئے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے۔ مگر ایلی اس سے سب سے زیادہ متاثر آتا ہے۔ جسے اس کے حسن کی ہر ہر ادا رومانیت کا مظاہرہ نظر آتی ہے۔ اس کی چال چھم سے آ جانا۔ اس کا دو پٹہ اوڑھنے کا انداز اس کے ماتھے پر ٹل۔ اس کے گورے گورے کھلنے بازو۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سنگ مرمر کے پیہ۔ اس کا لگاؤ اس کی بے نیازی۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شرمی کہتے ہیں۔ اور اس کی بے پناہ فہانت جس کی بنابر وہ سب کے باوجود ایلی سے شوخی کرنے

کا بہانا نکال لیتی ہے بار بار بیان ہوتا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطہ نظر سے جس کی بنابر اس میں حد و رجہ کا حسن ٹکنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ شہزاد سے انہیں خود ویسا ہی ولی تعلق ہے۔ جیسے ایلی کو تھا وہ ساری ناول ان کے تجربہ کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربہ میں جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوڑا ہے اور جس چیز نے ان کے تجھیں کو سب سے زیادہ آیا اور روشن کیا ہے وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح ہی کوئی محبوب ہے۔ ایلی کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفیاں تخلیں اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو وہ اپنا خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کروز نگاری کا نال ہے اور ان تمام معاملات میں حد سے زیادہ واقعیت کے ماتحت جزو ما نیہ پھیدگی تعجب پیدا کرتی رہتی ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کروز نگاری کے اعلیٰ ترین وجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد چشم سے آ جاتی ہے عجیب طرح روشن اور دلش ہو جاتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تکرار کے باوجود ان کا لطف کم نہیں ہوتا۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چائے پر بلانے آنا پھر اکیلے میں ایلی سے بے با کانہ مانا۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت اتنا قریب اور اس وقت اتنا دور ہو جانا عجیب کرشمہ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے۔ ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی حسین تاثرات کے باوجود اسے آسمانی چیز ہی کی طرح چاہنے لگتا ہے۔ وہ اسے قبول بھی کرتی ہے مگر ہاتھ بھی ہے۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے۔ اس کے گالوں کو سہلاتی ہے۔ اس کے چنگلی بھی لے لیتی ہے۔ مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو پسپا نہیں ہونے دیتی۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپا بیٹھا ہے اور یہ

انتظار کر رہا ہے۔ شہزادو ہاں آئے تو اس پر حمل آور ہوشنا دکو پورے طور پر سامنے لے آنے کا کمال ہے:-

دروازہ کھلا شہزادا ندر دخل ہوئی۔

ایلی بھل کی تیزی سے اپنی جگہ سے کلا اور لپک کر اندر سے کندھی لگادی۔ شہزادے ڈر کر ایک بلکل سی جیخ ماری۔

کندھی لگانے کے بعد وہ شہزادے کے روپ و کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پچان کی معین ہو کر بولی۔ ”تم یہاں؟“ ایلی کی خاموشی اور اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ وہ بولی ”تمہیں لیا ہو گیا ہے؟“

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ زیرِ لب چلائی۔

وہ صحیح تھی کہ ایلی اس پر حمل کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمتری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہنچ کی مضمون خیز کوشش کی ہے۔

”خدا کے لئے۔“ وہ چلائی۔ ”مہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوائی ہے؟“

”وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

”ضرور تم پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ بولی۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

”ہاں۔“ ایلی نے بھی انک آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں ہوں۔“

”ایلی کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ وہ چلائی۔“ ”پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔“

ایک رنگین دھندر لکا ایلی کے قریب تراتا گیا اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزادا کا خون چو سننے کے لئے جونک کی طرح آگے

بڑھے۔ ہاتھ بazio منہ سر جسم وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چونے لگا۔ پہلے تو شہزادے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تحک کر۔ ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گردھی۔ بھیا نک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی میں نیا ایندھن و چلیئے کی کوشش کی۔ چہار چار ریشمی کپڑے کے چھٹے کی آواز آئی۔ ”ایلی پا گمل نہ بنو۔“ ایک بار پھر مرمریں جسم کے اس تو دے میں حرکت ہوئی ”پا گمل نہ بنو۔“ مدھم آواز میں تکم سا احتجاج دیکھ کروہ اور بھی بھر گیا۔

دھپ۔ ایک ہوائی سی چھوٹ گلی اور معافر دو پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذمہ گیا ہو جا رون طرف اندر ھیرا تھا۔ گھورا ندھیرا۔ خفت نا کامی کا گھٹاٹوپ اندر ھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوالی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منقی احساسات کا ریلا اڑا آرہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنگا ہو۔ وہی تنگا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو منانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزادے کے بند بند چومنے لگا۔ اور بالآخر تحک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گردھی۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے۔“

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ پیٹھی اور اس کا بازو والی کی طرف بڑھا اور اس سے تھکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمیان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سر لش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تحکپ رہا ہو ماں کا ہاتھ عجیب نفیاتی اشارہ ہے۔ شہزاد عورت کے تمام منصب بڑی پیچیدگی کے ساتھ دا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی اور محبوبہ بھی۔ معشو قانہ انداز

پوری بیبا کی ساتھ اس میں شروع ہی سے دکھائی دیتے رہے۔ وہ ایک شخص کی قانونی بیوی بھی ہے اور پچ پیدا کرنے میں زرخیز بھی کہی جاسکتی ہے۔ مگر ایلی کی طرف اس کارجوان مادرانہ بھی ہے ہمارے معاشرے کے لوگ عورت کے باہت ڈھر سے اچھی یا بُری رائے دے دینے کے عادی ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں سے کس قدر بالاتر ہیں اور عورت پیچیدہ اور غیر فطرت کا لکناز بر دست مشاہدہ رکھتے ہیں۔

شہزاد کارویہ متقاضیوں والات ایلی کے دل میں لاتا ہے اور ہم بھی ان سوالات میں پڑ کر تعجب کے عالم میں آ جاتے ہیں۔ سوال یا لغتا ہے کہ کیا شہزاد ایلی سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ سامنے آتا ہے کہ ندا عتبہ مجھے ہے نہ اعتبار انہیں۔ مگر یہ صاف ہے کہ شہزاد کی اس زندگی میں جب ایلی چھٹی لے کر علی پور آتا ہے اور شریف بھی آموجود ہوتا ہے حركات سے محبت پکیتی ہے اور وہ اسے بڑی ذہانت سے بیبا کی کے روپ میں چھپاتی رہتی ہے۔ وہ ایلی کو ڈھونڈتے ہے جاتی ہے۔ اور اسے گھیٹ کر لے آتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے ایک فرضی محبوبہ کی باتیں کرتی ہے جن کا اشارہ اپنی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس پر دے میں صاف صاف عشق کا اظہار کرتی ہے۔ اور اسکیلے میں اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہے۔ گھر میں اور محلہ میں ہر ایک کوشہ ہے کہ وہ ایلی سے عشق لڑا رہی ہے۔ اور وہ اس عشق کو کبھی بیبا میں اور کبھی زکاوتوں میں چھپا لیتی ہے۔ اس کا چھم سے آ جانا۔ اس کا چھم سے آ جانا قیامت ہے۔ وہ وارثتہ بھی ہو جاتی ہے مگر اپنے کو سنبھالے رہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی افسردگی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور ایلی سے محبت کا بھی۔ اس کی محبت میں جنس کا مقام بھی سمجھے میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے اور پاک عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے میاں سے ایلی رقبابت محسوس کرتا ہے تو اسے سمجھاتی ہے کہ جسمانی تعلق کچھ نہیں ہے۔ کئی بار وہ کہہ دیتی ہے۔ ”تم مجھے سمجھتے کیا ہو۔“ تم مجھے نہیں سمجھتے۔ حقیقت میں وہ ایسا راز حیات ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے مفتی

صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شوخ تند خوکیا ہے۔ مگر وہ ایسا کر شمہ ہے۔ جسے انہوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہمیں محسوس کرنے میں پورے کامیاب ہیں۔ ایلی اس کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتا رہتا ہے مگر وہ اس کے دل و دماغ میں ایسی بس گئی ہے کہ چھپنے سے قصور میں آجائی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی لے زار رہی ہے۔ گھر کے ہر کام میں فرہ ہے اور دھڑا دھڑ پچھی ہو رہے ہیں۔ ایلی سے ملاقات ہوتی رہتیں ہیں۔ کٹھی بینا زاورا آخر میں اس چھپوں کی ماں سے کنوار ایلی شادی کر لیتا ہے۔ ایلی نوکر ہے اور وہ اس گھر کی ہی نہیں دل کی بھی شہزادی رہتی ہے۔ شادی کے بعد وہ ہمی پڑتی جاتی ہے۔ سخت یہاں بھی ہوتی ہے مگر ہومیو پیچکی دوسرے مردے سے بچ جاتی ہے۔ مگر اپنی شریف سے اڑ کی کے بارے میں اس کا ایلی سے جھگڑا ہوتا ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے ایلی اس سے الگ بھی ہو جائتا ہے اور ہمارا اول بھی اس کی طرف سے پھر جاتا ہے۔ آخر وہ دل ہو کر مر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قیامت کے حسن پر پانی پھر گیا۔ شہزاد کے ارتقاء کے سلسلے میں مجھے ناول نگار کی حیثیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کے آخری ہی دور کا کردار نہ دکھایا جاتا تو حسن اور خوبی کی مکمل تصویر ہمارے تخیل پر ثابت رہتی۔ ٹولسٹوی نے انا کارینہ کو اس درجہ پر پہنچنے سے۔

پہلے ہی مارڈا۔ فلاہیر نے میدم بواری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ مگر مفتی صاحب رومانی فنکار نہیں ہیں۔ وہ کامل ریلیٹ ہیں۔ وہ اس حسین مجسمہ کو رفتہ رفتہ مٹا بھی دکھاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ فنکار کو کچھ چیزیں چھوڑ بھی جانا چاہئے۔ بحر حال جس حسن و خوبی سے انہوں نے شہزاد کو پر اڑ بنا�ا ہے وہ ان کے تجربہ کا اور اس کو نہایت کامیابی سے پیش کرنے کا حق ہے۔ اردو ناول نگاری کی وہ سب سے زیادہ حسین اور واقعیاتی ہیر و نہن ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے حسن و کر شمہ کے اشارہ ہے۔ وہ ہر کر شمہ ساز عورت کا اشارہ ہے۔ وہ شیکشپر کی کلیو پا ترا کو نگر کی

میلانات۔ ٹولسٹوئے کی انانفلائیبر کی ایماء اور ہر عظیم ہیر و ن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ اردو کی بساط ہی کیا ہے \_\_\_\_\_ وہ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فتنی شاہکار ہے۔



مگر ناول کی ریڑھ کی ہڈی۔ روح روں اور جان ایلی ہے اور مفتی صاحب اسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کے ضمن میں آتے ہیں اور اس کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے نقش بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ان نقش میں علی احمد شہزاد کے نقش میں علی احمد شہزاد نقش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔ ایلی کے کردار واضح کرنے کے لئے ہی ساری ناول کا حصہ گئی اور اس کو منفصل طور سامنے لانے کے لئے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے باہت پیش لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایلی ایسا کردار ہے تمام تحریرے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بناء پر وہ اپنا کوئی کردار نہ نہ سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر خلائقی اور لفیضی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے جس کا مرکز علی پور ہے اور جس کا دائرہ امر ترا اور لا ہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ ولی اور سُبیتی میں بھی مقیم رہتا ہے مگر اپنی مخصوص پراسار صنعت نہیں کھوتا۔ ایسا پنچھی جو پانی میں ڈکیاں لگاتا ہے مگر پر چھاؤ کر پھر جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً ایسے لوگ کسی خاص جغرافیائی علاقہ سے مخصوص نہیں کئے جاسکتے۔ شاید بلکہ یقیناً ہر شخص کے اندر باوجود شدید اختلاف کے ایک ایلی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمول ہستی ہے اور اسی لئے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ معمولی انسان کہیں ڈھونڈھنے نہیں ملتا اس لئے اسے نایاب کہہ دیتے ہیں۔ ایلی وہ نایاب معمولی انسان ہے۔ مفتی صاحب کو وہ مل گیا ہے اور اسے انہوں نے صفحہ ناول پر اتنا روایا ہے۔ ناول کا شروع ہی سے یہ مقصد رہا کہ نارمل انسان کی شکل دکھائے۔ میلانگ نے ٹوم جنس میں ایسا ہی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لئے آج

بھی ماذل ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ایلی میں ایسا کردار پالیا ہے شاید وہ خود ایلی میں اور ساری سرگزشت ان کی آپ بنتی ہے۔ ان میں اویب کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی ہیں جو ایلی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر اپنی صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت حام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا حصہ دار ہے۔ وہ سرے ناول زگار جب اپنے کو اپنی ناول میں پیش کرتے ہیں تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں یا کہاں میں اپنے کو اصلیت سے گرا کر پیش کر دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کو نہ بڑھانے سے سروکار بہت نہ لٹھانے سے ان کے ذاتی تجربے سے جو آدمی شخص آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ عموماً بڑا آدمی اور اس کا کوئی بڑا کام بنتی پیدا کر لے کے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایلی میں کوئی بھی بڑا لی چھوڑ بھی نہیں گزری اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا۔ نہایت معمولی ماحدوں سے زندگی بھر گرتا رہا۔ احساسِ کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوتِ ارادہ کا تو اس کے اندر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتار ہا۔ ٹوم جنس راسکل ہے مگر تجربہ اسے ہیرہ بنا ہی دیتا ہے جو من ناولوں میں جنہیں ROMAN BUILDING کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہو اور نظر آتا ہو اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایلی یوں بھی ارتقاء نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے پر جھاؤ کرو یہ کاوسیا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی قدروں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں گڑا ہوا پوچا ہے جس کا رہ جان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر اوقاف کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ جاندار نہ بنایا گیا ہوتا تو وہ جیتا بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹتے ہی بڑا لکھیا کہہ دیں گے مگر وہ

اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امر تسر کے جوار کے لوگوں سے ملنے تو ان میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوس طبقہ کافر دایلی معلوم ہو گا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر مستعد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی ایک معمولی دھڑے پر لگ گئی ہو گی۔ بچپن ہمیں میں یا گھر کے معمولی کام بدولی سے کرانے میں گزرا ہو گا۔ زبردستی اسکوں اور کافی بھی گیا ہو گا۔ اور کسی نہ کسی طرح تعلیم غپتا کر معمولی ملازمت پر بھی آگئی ہو گا۔ سبی طور پر اس کی منگشی اور شادی بھی ہو گئی ہو گی۔ اگر اس میں غیر معمولی بات ہو گی تو وہ اس کی سورقہ کی طرف توجہ سے نمایاں ہو گی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جاسکے گی۔ ایونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی کی طرح کی جنسی دلچسپی رہی ہو گی۔ عشق و حسن کا معیار اگر پست نہیں تو اعلیٰ بھی نہیں ہو گا۔ زندگی سے لگاؤ بھی جبلی سطح کا ہو گا اور اس میں ان خاص جذبات کے زور کی کوئی گنجائش نہ ہو گی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم اچھا آدمی نہیں کہہ سکتے تو رابھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خود فرضی بھی واجبی واجبی ہو گی۔ وہ ایک گھٹیا سامعلوم ہو گا جوز میں پرانا جسم بڑھاتا گھٹاتا ہو انظر آئے گا۔ وہ اچھائیوں اور برائیوں میں پڑنے کا برادر اہل اور نا اہل ہو گا۔ ہم خالص جذباتی EVERYMAN کی تصوری ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معلوم ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہریوں اور ان قصبوں اور ان گاؤں سے مخصوص ہیں جہاں ایلی جاتا ہے۔ اس کی لا تعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تو لے جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم انکل رہا ہے اور ناولوں کے ہیر و اس لئے دلچسپ ہوتے

ہیں کوہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی ہی ہے کہ وہ ہر کام نا اہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے۔ اور اس کی بنابر ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باقیتی حماقت میں مگر ہم کو ان پر فہمی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہرگز احمدی نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ تکڑم با توہی کر رہی نہیں ہوتا۔ وہ کسی کو برائی نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی سے دھوکے میں بھی نہیں ہوتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھنلاہٹ کے باوجود ایک عزم اور استقلال آ جاتا ہے اور وہ اس سے ہر مخالفت کے باوجود شادی کر لیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک کرہے سکتے ہیں گر شہزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شہزاد ہی سے اس کا جھگڑا ہو کر رہتا ہے شہزاد سے عشق اور آخر میں شہزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر نہایت درجہ معمولی رویہ کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کے ”ذہن“، قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ زیادہ مستقل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذهب کے بابت مفتی صاحب بتاتے ہیں۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر چہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈرکی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخيّل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جنہیں خیز کی فلکیات ہاؤں مکملے کے ساتھ کا عجز سے متعلق مضامین بر ڈرینڈ رسائل کے فریکیس ستیاٹ کے جذبات کا اونٹ کریمکیں کے مشاہدات اور ایج۔ جی ویلز کی سائشیفک فلکشن کتابوں سے اخذ تھا۔

ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخلیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔  
اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہوا اللہ ہوتا، عظمت عظمت عظمت عظمت محبت کا  
سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس نے بیان کیا کہ اس کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس  
نے مغربی علماء کی تحریروں سے اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں لیکن اس کی جذباتی دنیا و فنی  
خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلی ویسا معمولی نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا  
ہے۔ اس کی وہی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ  
ایسی واقعاتی دنیا میں ہے جہاں وہ مخفی انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایلی کی اور اس دنیا  
کی وہی اور کرداری سطح ایک ہے۔ اس لئے وہ نمائندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری  
دور میں وہ معمر بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمر نہیں تھا۔ سب  
سے بڑا معمر یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور معلوم ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب  
میں ڈالے اور معمر ہوتی جائے۔ ایلی اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی  
سے ایسی ہی چیز ہے۔

سلطی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہو گا کہ یہ ایلی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس  
طرح کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر  
غور سے دیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مر  
کزی کردار کی اندر وہی زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے۔ ظاہرہ واقعات کے  
ساتھ ساتھ ایلی کی اندر وہی دنیا بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی  
سو تیلی ماں صفیہ کی طرف رونما اور اس کے مہندی لگئے ہوئے ہاتھوں سے اسے  
نفرت کا بھی تجذیب ہوتا رہتا ہے۔ شہزادہ کا عشق ایلی کی اندر وہی یا وہنی کشمکش کا اظہار  
ہے وہ گومگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے دماغ میں چل گیا ہے پوری

نفیا تی تھیں کے ساتھ بیان ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی ہے۔ اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی لگا ہوا ہے۔ تو بھی شہزاد چھپن سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندر وہی اور بیرونی دنیا میں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح وہ سطحون پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر جمیں جو اس کی "جولیس" میں کہتی ہے۔ مفتی صاحب INTERNAL MONO LO GUC کے نام سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چاکب دتی سے بر تھے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفیا تی کو افسانہ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں مال پر ایلی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی شہزاد ایلی کے ایک زندہ حقیقت ہے جو اسے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ مت قسم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے تو اس کے تصور میں شہزاد اسی طرح آتی ہے۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی۔ "میں رکاوٹ تھی۔ میں دوڑا گئی۔ وہ بولی۔" ایلی نیا جیون جیو۔ نیا جیون جیو۔"

شہزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شہزاد سے لڑ کا عالی ہو جاتا ہے۔ وہ سببی میں یہ سن کر کہ گور داں پورہ ندوستان میں آگیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ امر ترا اور علی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھاٹھائے رو رہا تھا

---

پرمٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ "عالی عالی۔" اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھا کہ ہوا بچہ بلک رہا تھا۔ بہر حال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے

نمایاں ہے اور ناول کا خاتمه یوں ہوتا ہے:- حضور حضور ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

مفتش صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستو فسکی کے ”بر اور کار عازم اف۔“ کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی کردار نگاری دوستو فسکی سے گہرے طریق پر متاثر ہے۔ ایلی کے کردار میں دوستو فسکی کے فن کاوا لمانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تخلیل نقشی میں جدید ناول نگاروں کے لئے مائل ہے۔ مفتش صاحب بھی اس مائل پر چلتے میں اپوے کامیاب ہیں۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کو ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے۔ ادو ناول نگاری میں قریباً ایک مشتمل جنہاً کاڑ دیتی ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تقيید کرنے میں تقيیدے کے پر جل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اٹھی۔ اس کارخ واقعیت کی طرف ہے جو ناول کی جان اور واقعیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ روئی ناول کی تفصیل اور جزئیات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برقراری ہے اور پھر جدید واقعیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ عاملوں سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول کا شخصیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دوسری شخصیم تین ناول ہو بھی گئی ہے۔ مگر مفتی صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اسے جانچنے وقت تمام اصول اٹوٹ چلتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پوری زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنا تجھیل اثر جانتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میتحو آرنلڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا۔ کہ ادب کو زندگی پر تقيید ہونا چاہیے۔ مگر لوٹھوکی ”انا کارینہ۔“ پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہا کہ یہ تقيید حیات نہیں ہے بلکہ ہو بہوات ہے۔ مفتی صاحب کی واقعیت نگاری اور نفیات نگاری کے بابت بھی ایسا ہی کچھ کہہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدودنا پے جاسکیں یا جس کے تاثرات کے صحیح یا غلب ہونے کا اندازہ لگایا جاسکے۔ یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے۔ مفتی صاحب اسے ”ڈھیر۔“ کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ وہ ہو بہوزندگی کی طرح ہے اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو پسپا کر دیتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فنکاری میں ناکامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگا گئے ہیں۔ مگر ان کی ناول کا منظر ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا ناوانی مان لیتے ہیں۔ یہ ناول ہے۔ اس معنوں میں ناول

نہیں جو ایک دلچسپ قصہ سننا کرہمیں محفوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی کی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے حمایت میں لائی گئی ہے۔ اس میں وہ پھیلاوے ہے اور جزئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روی ناول نگار سب نے آگے بیڑا۔ اس میں زندگی کا ساقچہ حاوہ اور اتار ہے اور قصہ ہیرہ کے چھپنے سے شروع ہو کر ایک نئی زندگی کے آغاز تک جاتا ہے اس کی کوئی بندھی بیویت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے۔ یہ ایک عظیم دریا کی طرح ہے جس کا خرچ ایلی کا ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا آصفی محلہ علی پور امر تسلیم ہو رکتا ہے۔ وہ سارا خطہ جو روز اسپوہ سے لے کر لا ہو رکتا ہے اس کی وسعت میں آ جاتا ہے۔ پھر یہ بیویت کی پھیلیں اگر مندر کو بھی اپنے میں ملایتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلنے لگتا ہے۔ جتنی وسعت بڑھی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور بار بار آتے رہتے ہیں۔ یہ ایلی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایلی خود ہے جس کو ہم اس سیالاب میں ہر جگہ بکلی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو ماں کا شناور کہنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شناور کی سی طبیعت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ بہاچلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح کا ہے مگر سب سے مختلف ہے۔ وہ فرد بھی ہے مگر اس کی انفرادیت کی حد متعین نہیں ہو سکتی اور ہم اسے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ناول میں بس وہ ہے اور شہزاد تک اس کے ذوق کی پیداوار ہے۔

”یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایلی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جانے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ ”علی پور کا ایلی۔“ ایک خود نوشہ سوانح ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کام صنف اپنے کو ضرور پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتنا نہیں سکتا۔ نام بدلتے سے اور تخلیل کے دائرے میں آنے سے صنف خود دوسرا آدمی ہو جاتا ہے۔ اس لئے

ایلی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور ایلی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تجھیں کی تحقیق  
ہے اس کی سرگزشت کتنا ہی واقعات کا نقشہ ہو مگر وہ زندگی کی ایک نظریہ  
حیات کے مطابق اور ایک فتنی نظر کے مطابق تغیر ضرور ہے۔ علی پور کے ۲ صفحی مخلصہ کی  
سماجی اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا نہ ہب عالم اسلام ہے جو ہندویت اور تصوف سے  
متاثر ہے۔ ایلی اس نہ ہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں  
سے بالآخر ہو گیا ہے۔ وہ تو ہمات میں عقیدہ کرنے سے الگ رہتا ہے۔ اسلام کا دینی  
درجہ پر اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپیں فلسفیوں سے اس نے عظیم تصور خدا  
حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے صفات اخلاقی قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا  
احساس رکھتا ہے۔ اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا  
ہے اور اسے حورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزادے کے حسن کا وہ  
گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کنکش  
ہوتی ہے۔ اور وہ شوہروالی چھپجھوں کی ماں سے شادی کرہی لیتا ہے۔ اس کا دب کی  
طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دچپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحافی ہو  
جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا اکارنا مدد نہیں پیش کرتا مگر فلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس  
میں احساس کمری کے باوجود وہت اور استقلال بھی آ جاتا ہے۔ اسے سیاست غرض  
نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور ہوتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور  
ہے مگر وہ پاکستان میں آ جانے کو نیا جیون سمجھتا ہے اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ  
حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کو ٹھوںس ٹھانس معلوم ہو مگر اس کا ایک  
جدید نظریہ حیات ضرور ہے۔ اس میں وقت ارادہ کی کمی صاف صاف نمایاں کمی مگر  
وہ اپنے ارادے کا پکا بھی ہے اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرتا ہے وہ کر گزرتا ہے اور  
اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطہ نظر کو  
مفتقی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجربیدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے

واقعات اور عمل نقطہ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعات ہی واقعات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جاتے ہیں یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے۔ شیکسپیر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس کا نقطہ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تخلیق کے عملے میں بھی ہر فن کاری سے اپنی بے نیازی کا ظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی فن کارانہ ترتیب۔ انتخاب ارتفاع سے منہ موڑ لیجھے ہیں مگر اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی ان فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اس میں مشق مسلم ہے اور بیان طویل چیز کو رابطہ دینے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن کے تابع نہیں ہیں مگر فن ان کے سامنے ہاتھ باندھ نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں اور اس کی باغِ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے ادا ہوتا ہے۔

ور پس آئینہ طوٹی صفتقم داشتہ اند آنجا استادا زل گفت ہماں می گویم  
مگر وہ ایسی طوٹی ہیں جس کو استادا زل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آگئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور ظاہرہ بے پرواہی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امنہ تا چلا آرہا ہے اور وہ اسے بغیر زور لگانے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور انگلی کے سیالب میں ایسا چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فن کاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی دادی جاسکتی ہے مگر فن کو چھپانا کمال ہے اور مفتی صاحب اس کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ سلطھی نظریہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ ”علی پور کا ایلی۔“ میں کوئی فن

نہیں اور اس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا مگر غور کی نظر وہ  
کو یہاں وہ فن نظر آئے گا جو بہت اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا  
ہے جہاں فن کا روپ اٹھے۔

ہم وہاں نہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں اس بات پر واپس آتا ہوں کہ ”اے آدم بھی انعام نہیں دیا گیا۔“ ممکن  
ہے کہ اس بات پر پلیک سے شکایت مگر اس سے انعام دینے والوں کی نااہلی کی  
طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور  
اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہوگا، اس بات کو طے کرنے  
والے ”قادِ“ ہوں گے اور میں اُن کو ہی نہیں بلکہ ان کے اچھے اچھوں کو ناول پر  
تفصیل کرنے کا نااہل قرار دے چکا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے  
کچھ لگے بندھے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ”علی پور  
کا ایلی۔“ کے ایسے اور ریجنل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی فقاد  
کسی نئے راہ کو مجھنے کے اہل نہیں ہوتے برداشت نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے  
بابت کہا ہے۔ ”مجھے اس کی قدر کرنے کی فقاد سے کوئی امید نہیں ہاں ان صاحبان  
ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ادبی پرنسپل لیتے ہیں۔“ ”آلارشر  
سے دوستان بارود۔“ کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے فقاد بھی اس کی ضخامت کی  
شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے شکایت کی ان سے مل کے کہا۔ ”آپ کو پڑھنے  
کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ  
ہوتی۔“ اصل بات یہی ہے کہ ہمارے پروفیسر فقاد کے لئے ادب لگائے بندھانے  
کا سو دا ہے اور وہ جو طالب علم کاں رہے ہیں وہ بھی ان کے سے ہوتے ہیں۔ ”علی  
پور کا ایلی۔“ کو وہ مقبولیت بھی حاصل ہے جو آج دوسری ناولوں کو ملی۔ مگر مجھے یقین  
ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے جائے گی اور اس سے لوگ ناول

کے آشنا نے راز ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں مادل ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلاش سے پاک ہے جو فن و فکر کے بہانے ناول سے وابستہ کی جا رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب ”ناول کیا ہے؟“، پچھیں بر سپہا لکھی تھی۔ اس وقت ”علی پور کا ایلی، وجود میں خیزیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا“ علی پور کا ایلی کو پڑھ دا المعلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے؟ کیا ہونا چاہئے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آجائے۔ ”حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دوسری ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔

# مصنف کا نوٹ

اگرچہ علی پور کا ایسی ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے لیکن دراصل یہ ممتاز مفتی کی خود نوشت آب بنتی کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب کی واحد خوبی ہے کہ اس میں ہر واقعہ سچ بیان کر دیا گیا ہے۔ اخلاق، ادب، روایت اور چھر سے بے نیاز ہو کر۔ عبادت آرائی سے پاک بناؤٹ سجاوٹ سے بے نیاز مجھے یقین تھا کہ اس کتاب کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی، لیکن زبان دانوں اور ناقدوں نے اسے شرف قبولیت بخش دیا۔ یہ پ ان کی گرم نوازی ہے۔

**مصنف کے آبادش فیروزوالی اور احمد راست قلم کے قلمی کتابوں سے اخذ**

**شدہ کوائف**

شہر بیالہ پاک و ہندو صیر میں آقر یا ۲۷ چول بلڈ اور ۳۲ عرض بلڈ پر ۱۳۶۵ مطابق ۸۶۹ھ بہلوں لوڈھی کے دور حکومت میں آباد ہوا سواہویں صدی عیسوی میں بواب شمیشر خان ۳ کروڑی ناظم علاقہ ماتھے ودو آپ جانندھر نے بیالہ میں مستقل رہائش اختیار کی ۹ اور اس شہر میں عالیشان عمارت، خوبصورت باغات و سعی تالاب تعمیر کئے اور یوں شہر کو فروغ ملا۔ خاندان مغلیہ کے دور حکومت میں بیالہ کو پر گنہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا انتظام ایک کروڑی منصب دار کے سپرد تھا۔ سکھوں کے زمانے مہاراجہ رجیت سنگھ کی بیوی مہتاب کو رکی والدہ سدا کور اور مہاراجہ شیر سنگھ عرصہ تک بیالہ میں سکونت پذیر ہے اور مہاراجہ رجیت سنگھ اکثر موقعوں پر بیالہ آکر نواب شمیشر خان کے بنوائے ہوئے تالاب کے قریب کئی روز متوالی قیام کرتا۔ بر طافی راج میں بیالہ کافی عرصہ تک ضلع کا صدر مقام رہا اور بعد میں حکومت نے ضلع کا صدر مقام بیالہ سے گورا سپور منتقل کیا اور بیالہ کو تحصیل بنادیا۔

آزادی پر صیر اور تقسیم صوبہ پنجاب کے وقت ۱۹۴۷ء میں بیالہ شہر کی آبادی پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی، شہر بیالہ کی جنوبی فصیل میں دروازہ کلاں ہے جسے تقسیم

پنجاب تک بڑا دروازہ یا ہاتھی دروازہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس دروازہ کے اندر کچھ فاصلہ پر شہر میں شمال کی جانب ایک قلعہ نما محلہ مفتیان تھا، جسے عام شیخاں حولی بھی کہتے تھے۔ یہ محلہ ستمبر ۱۹۳۷ء تک خاندان مفتیان بٹالہ کی اقامت گاہ رہا اور تقسیم ملک کے بعد اس کا نام چتوڑگڑھ کھا لیا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں بٹالہ میں چار روپیش وارڈ ہوئے۔ چاروں عرب نژاد بزرگ ایران سے اپنے عقائد کی حفاظت کی خاطر ہندوستان آئے۔ ان کے قافلے میں ایک مرزا غیاث بیگ بھی تھے۔ جن کے اس غرضے دو طرف ایک رُکنِ تبلذہ ہوئی جس کا نام مہر النساء رکھا گیا اور جو بعد میں نور جہاں کے لقب سے ملکہ جماں لیا ہے۔ یہ چار بزرگ بٹالہ میں مقیم ہوئے اور بااتی قافلے آگئے وہی کی طرف چل دیا۔ ان بزرگوں میں سے ایک فقیر منش اور روپیش صفت بزرگ نے شہر سے باہر شمال مشرق کی جانب ایک میل کے فاصلہ پر گوشہ نشینی اختیار کی اور مصروف عبادت ہوئے۔ ان کی وفات پر وہیں ان کا مقبرہ بنایا گیا۔ دوسرے بزرگ وزیر صاحب کے شہر کے دروازہ کلاں کے باہر جنوب کی سمت تقریباً آدمی میل کے فاصلہ پر گوشہ نشین ہوئے اور ان کی وفات کے بعد وہیں ان خانقاہ زیارت گاہ خاص و عام بنی تیسرے بزرگ شہر کے جنوب مشرق حصہ (اندرون نصیر الحق دروازہ) میں سجادہ نشین ہوئے اور ان کی اولاد میں قادر یہ سلسلے کے کئی خدار سیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ ہوئے۔ چوتھے بزرگ شیخ فیروز ولی بن شیخ بہلوں بن شیخ جلال تھے۔ شیخ فیروز ولی کے بٹالہ پہنچتے ہی قاضی عبد اللہ خطیب ان کی علمیت اور قابلیت سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے ہمسایہ میں ایک مسجد کے قریب رہنے کی دعوت دی اور ملازمت حاکم کی ترغیب دلائی بلکہ شیخ فیروز ولی کی خواجہ معین تک رسائی کرائی۔ جس سے شیخ فیروز ولی کا اشتغال روراً روز ناچھے نرخ پر ہو گیا۔ شیخ فیروز ولی مسجد کے نزدیک اولین رہائش گاہ اور قریبی علاقہ کے گرد

۱۵۸۹ء میں ان کے تیرے صاجزادے شیخ فتح اللہ صدی نے فیصل کھجی کر محلہ مفتیان کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۹ء میں ایک اور نظریہ فروغ پایا کہ شیخ ولی بن شیخ بہلول (بہیلو) بن شیخ جلال (جلو) بن ودوہ بن نادر بن لکڑ بن جیل بن بانی اسل بن سپل بن شاہ تلوچ قوم راجپوت موضع بوہ پر گنہ ہیت پور پیش سے خضر خان گورنر لاہور کے ہاتھوں موضع بوہ کی تباہی کی وجہ سے اپنے موروثی علاقہ سے کئی سو گاؤں میش چھوڑ چلے اور موضع گوبندوال اور موضع رائے پور سے ہوتے ہوئے بٹالہ پہنچ تھے۔ باقی تفصیلات میں البتہ کوئی فرق نہیں۔ شاید کوئی تحقیق طلب ان نظریات کی حصی کو بلحھائے۔ جب کہ ہر دو نظریات بے کم و کاست خاندان مفتیان کے اجداد کے بارے میں یہاں رقم ہیں۔

شیخ فیروز ولی کے دوسرے فرزند شیخ احمد فیروز ۱۵۵۳ء میں شیخ فیروز ولی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا اسم مبارک سلیم خاتون تھا۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی شیخ محمد ولی کی عمر دو یا تین سال تھی۔ آپ نے بٹالہ میں ہوش سنجالا، مسجد کی قربت اور والد کے علمی ذوق اور مشاغل کے درمیان اپنے بڑے بھائی شیخ ولی محمد (تاریخ پیدائش ۱۵۵۶ء) اور چھوٹے بھائیوں مسکی شیخ فتح اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۵۸ء) اور شیخ نعمت اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۵۶ء) کے ساتھ احسن تربیت پائی۔ خود فتنی طبیعت تھے۔ بچپن میں تبدیلی وطن کی صعوبت برداشت کی جس نے عمر بھر کے لیے محنت اور کاوش کی عادت ڈال دی۔ رقوم ثنا، تفسی، تعلیق، نتعلیق و سیاق اور خط شکستہ میں کمال حاصل کیا اور جدت پسند طبیعت نے ان میں نئی اختراعات پیدا کیں۔ ادھر خاندانی روایت کے تحت فتوں حرب میں ایسی استعداد حاصل کی کہ مغل اور افغان آپ کی تیراندازی کی تعریف کرتے۔ آپ بیس سال کی عمر میں نواب و زارت پناہ قاضی علی سلطان کے سر خط نویس مقرر ہوئے پھر روزنا مچہ پر ترقی پائی۔ اور وویسٹی منصب پایا۔ نواب جالینوس الزامانی حکیم ابو الفتح اور حکیم ہام گیلانی جیسے

نامور بزرگوں کے مقرب رہے۔ اور تقریباً چیلٹیس سال کی عمر ۹۹۶ھ میں دوان پر گنہ شہر کوٹ اور پر گنہ فاربرہ مقرر ہوئے۔ ۱۰۰۳ھ میں خواجہ طاہر محمود والد خواجہ طاہر محمود والد خواجہ عما الدین اور نواب آصف صفات آصف خان کی وساطت سے دربار اکبری پہنچے اور بادشاہ کے دہن مبارکہ "نر است قلم" کا لقب پایا۔ اکثر امراء نے آپ کو مبارک دی۔ اس وقت آپ کے طھوٹے بھائی شیخ اللہ شاہی تخت کے پاس نواب آصف خان کی منڈ کے حلقہ میں کھڑے تھے۔ چند روز بعد بادشاہ نے منصب میں بھی ترقی دی۔ دو دفعہ شیرکا دورہ کیا۔ ابوالحیم ہمام کے ہمراہ ۱۰۰۴ھ شہنشاہ اکبر کے جلو میں توکن والوہ اور بہان اپر کی مہماںت میں شامل ہوئے۔ نواب کا لقب اور کروٹی منصب پایا۔ شاہی دربار میں آگرہ پہنچنے تو وہاں رو سا اور امر آپ کی مہمان داری کا شرف چاہتے۔ ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۶۲۰ء شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کی مہمان داری چھ روز تک بیالہ میں کی اور بارہ روز تک رسد بیالہ سے کلانور بھجوائی۔ یہ تجدید نیا وی دولت عزت۔

شبیہ کا یہ عالم تھا کہ بسیار خوش صورت پوشاک اور طریق یوں اپنائے کہ وہ بار اکبری میں اکثر امرا آپ کو مغل زادہ سمجھتے۔ اخلاق حسنہ کی بلندی کا یہ حال کہ غربا کی مد فرماتے۔ فقر اکو گھر بلاستے، مہمانداری کرتے اور عزت و احترام سے پیش آتے۔ پاکبازی، خشوع، ہر دعڑیزی، لبریائی اور راست گفتاری میں مشہور وقت جس کی مندرجہ ذیل جھلکیا اس زمانے کے خطوط میں ملتی ہیں۔

“شیخ احمد راست قلم و دوست کردوار——”

راستی شد چوں شعار قلمش احمد راست قلم شد حلمش

”بے تکلف و مبالغہ“ یعنی روزے نیست کے ان کہن سال دو دمان اخلاص یعنی پیر

عدالت گزیں شیخ احمد را از صمیم قلب یاد ہمکنیم و از مفادقت قسمت اوتا سف  
نداریم....."

حق گوئی میں اتنے یکتائے زمانہ کہ بڑے بڑے آپ کی وکالت اور فیصلے کے خواہاں رہتے۔ گھر میں ہر بزرگ و خور دکا صلاح مشورہ لیتے اور اگر کوئی مشکل پڑتی تو خاندان کا اجلاس طالب کرتے پھر نقش عمل مرتب کرتے۔ نہایہ روزہ اور ذکر خدا میں کسی حال کوتا ہی نہ کرتے اور ہر دعا میں روح بزرگان کا ثواب بخستے۔ اور سلامتی افراد خاندان کی وعافر ناتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عشق تھا۔ چہار یا رہ با صفا کے مداح۔ حضرت غوث الشفیعین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاخوں اور حضرت فرید گنج شکر علیہ رحمۃ اللہ کے مرید تھے۔

حضرت والدہ اور بڑے بھائی کی عنایت کرتے۔ چھوٹے بھائیوں اور عزیز گان سے شفقت سے پیش آتے۔ اور جب بھی کار دنیا سے فرصت ملتی روپہ حضرت فرید گنج پاکستان اور والدہ کی خدمت میں بیالہ حاضر ہوتے۔

قصہ مختصر نواب شیخ احمد فیروز راست قلم کروڑی نے اپنی زندگی میں کارہائے دنیا و دین میں صحیح توازن رکھا۔ ۱۲۳۳ء میں اس توازن کا نقشہ یعنی اپنی رومداد (۲۰۲) دوسو دو حکایات کی صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فارسی کتاب "قصص الامد" میں محفوظ کر گئے۔

شیخ فیروز ولی (جیسا کہ ہم بزرگوں سے سنتے آئے ہیں) سادات ہاشمی تھے۔ جن کے بزرگ عرب سے آ کر ایران میں آباد ہوئے۔ اور جب شیخ فیروز ولی نے اپنے عقامہ کے تحفظ کی خاطر حالات ایران ناسازگار پائے تو اپنے خاندان سمیت مغلیہ عہدے میں ہندوستان چلے آئے اور بیالہ میں اقامت اختیار کی۔ شیخ کا لقب انہوں نے اپنے علم، عمل اور قابلیت کی بنیاد پایا تھا۔ اس سلسلہ کا ذکر سید عبدالجید امجد بخاری چشتی سلیمانی نے بھی اپنی کتاب "یادا یام"۔ (بیالہ اور مشاہیر بیالہ کی مختصر

تاریخ) (سولہ ۱۹۶۹ء) میں صفحہ نمبر ۷ پر کیا ہے۔

تفصیل کے وقت بٹالے کے مسلمان شہر بد رکروئے گے۔ مفتیاں محلے لکے لوگ یا تو راستے میں دھم توڑ گئے یا پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن سب بکھر گئے۔

اس خود نوشت میں جس دور کا تذکرہ ہے۔ اس دور میں بٹالے کے مفتی شدید انحطاط کے شکار تھے۔

مصنف یا اس کے فرضی نام اصلی نام عزیز سے رشتہ مصنف

ایم۔ الیاس ممتاز حبیب All rights reserved. 2002-2006 معرفت نواب بی بی دادی

پر دادا اولادی میراں بخش دادا

نو جوانی میں فوت ہو گئے۔ محبوب علی مولا بخش دادا

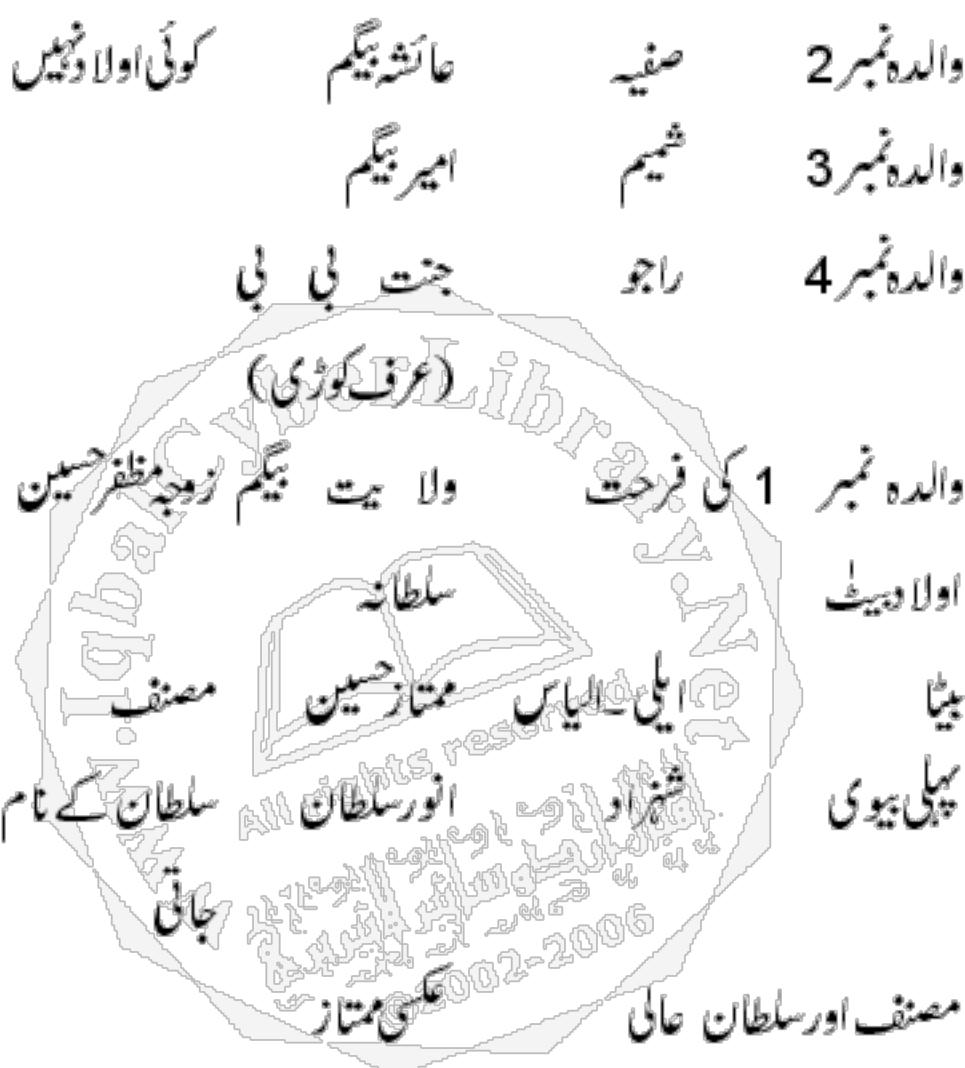
مصنف کے والد کی پرورش ان کے دادا نے کی نام خاندان

تحلیہ حکومت کے دوران اس خاندان کے اکثر بزرگ یکے بعد دیگرے مفتی کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس لئے یہ

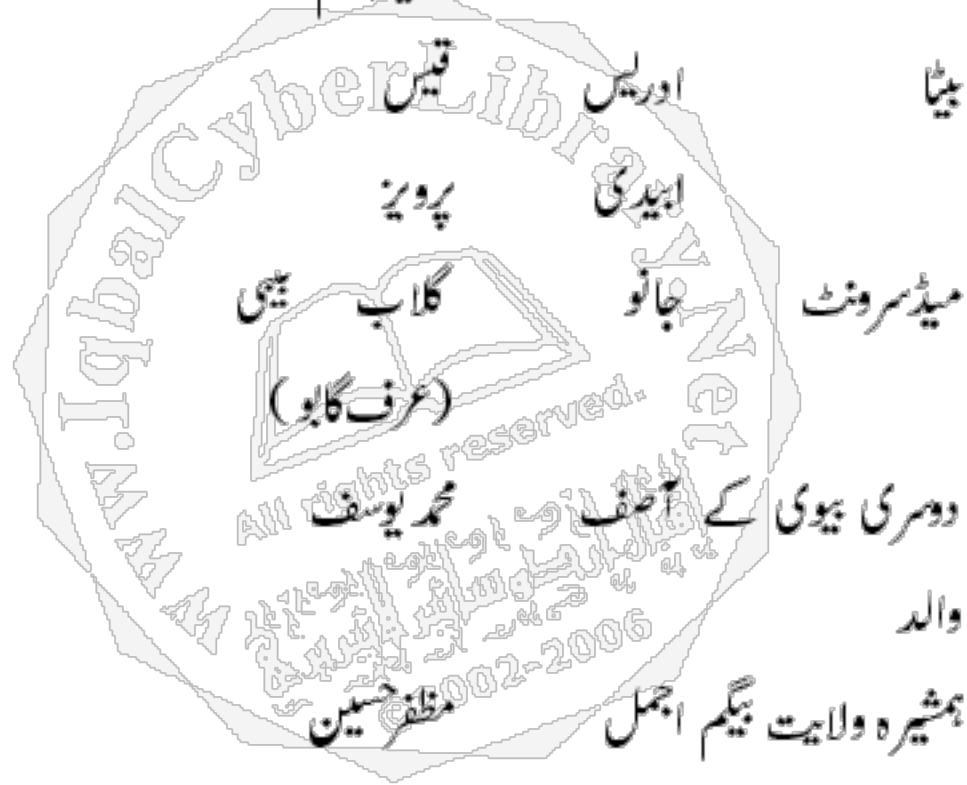
خاندان مفتیاں مشہور ہوا۔ والد

علی احمد ماسٹر محمد حسین محلہ کی تعلیم پنجاب میں ملازم تھے اس لئے ماسٹر کہا جاتا

والدہ نمبر 1 ہاجرہ صغرا بیگم



والدہ نمبر 2	صفیہ	کوٹی اولاد نیمیں	عائشہ بیگم
والدہ نمبر 3	شیم	امیر بیگم	
والدہ نمبر 4	راجو	جنت بی بی	
والدہ نمبر 1 کی فرحت	ولادت بیگم زمیجہ مظفر حسین		
اولا و بیٹہ			
بیٹا			
پہلی بیوی			
مصنف اور سلطان عالی			
کاپیٹا			
دوسری بیوی	بلند بخت	سلطان کی وفات کے بعد	اقبال بیگم
شاوی			
پہلی بیوی کے رشتہ غلام علی	شیخ غلام حسین	اشیشن ماستر تھے	
داروالد			
والدہ	بیگم	برکت بی بی	سافوری
ہمشیرہ		عرف بے بے	وزیر بیگم
بھائی	شوکت	ممتاز حسین	نام "ائچ ممتاز" اپنایا
پہلا خاوند	فضل حق	شریف	اشیشن ماستر تھے۔
اولا و بیٹی	ارشاوبیگم	اصبیحہ	پہلے خاوند سے اصبیحہ



三

پہنچ

(عہجہنڈ)

پھوپھا نیروز ظہور الحسن

پھوپھی زاد بھائی اجمل مختار حسین ہمشیر ہ ولایت بیگم کا شوہر

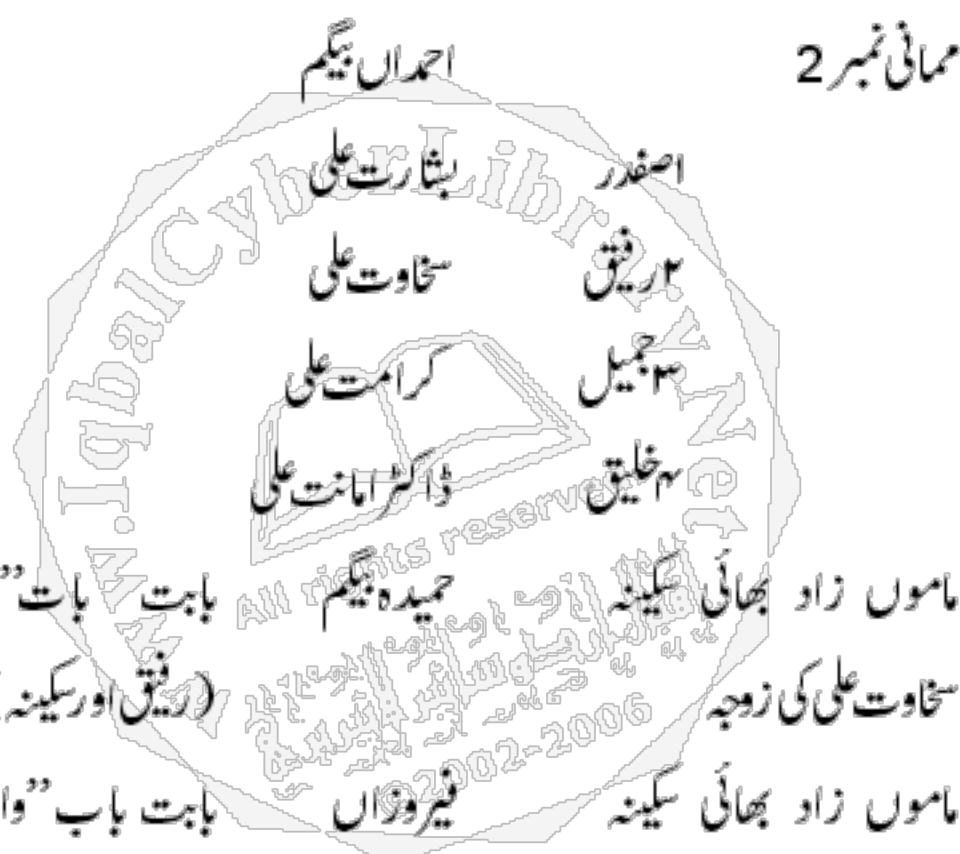
# بہن انجیاز مذربتوں روجہ شیخ حسام الدین

۱۲ انور انوری منور بیگم زوجہ پروفیسر فضل شاہ گیلانی

٣٤٢ زوجة وأكثر فيض الحسن لطيف بيكيم

سیده زوجہ شیخ محمد افضل سردار بیگم

مصنف کے چھی عظمت امتہ از ہرا احتل ظہر اس جوانی میں لا ولد  
ماموں مہانی نمبر 1 انتقال کیا



ماموں زاد بھائی سکینہ حمیدہ بیگم باہت بات "پہلی محبت سخاوت علی کی زوجہ" (ریش اور سکینہ)

ماموں زاد بھائی سکینہ حمیدہ بیگم باہت باب "واپس (جھپڑے پر بشارت علی کی زوجہ

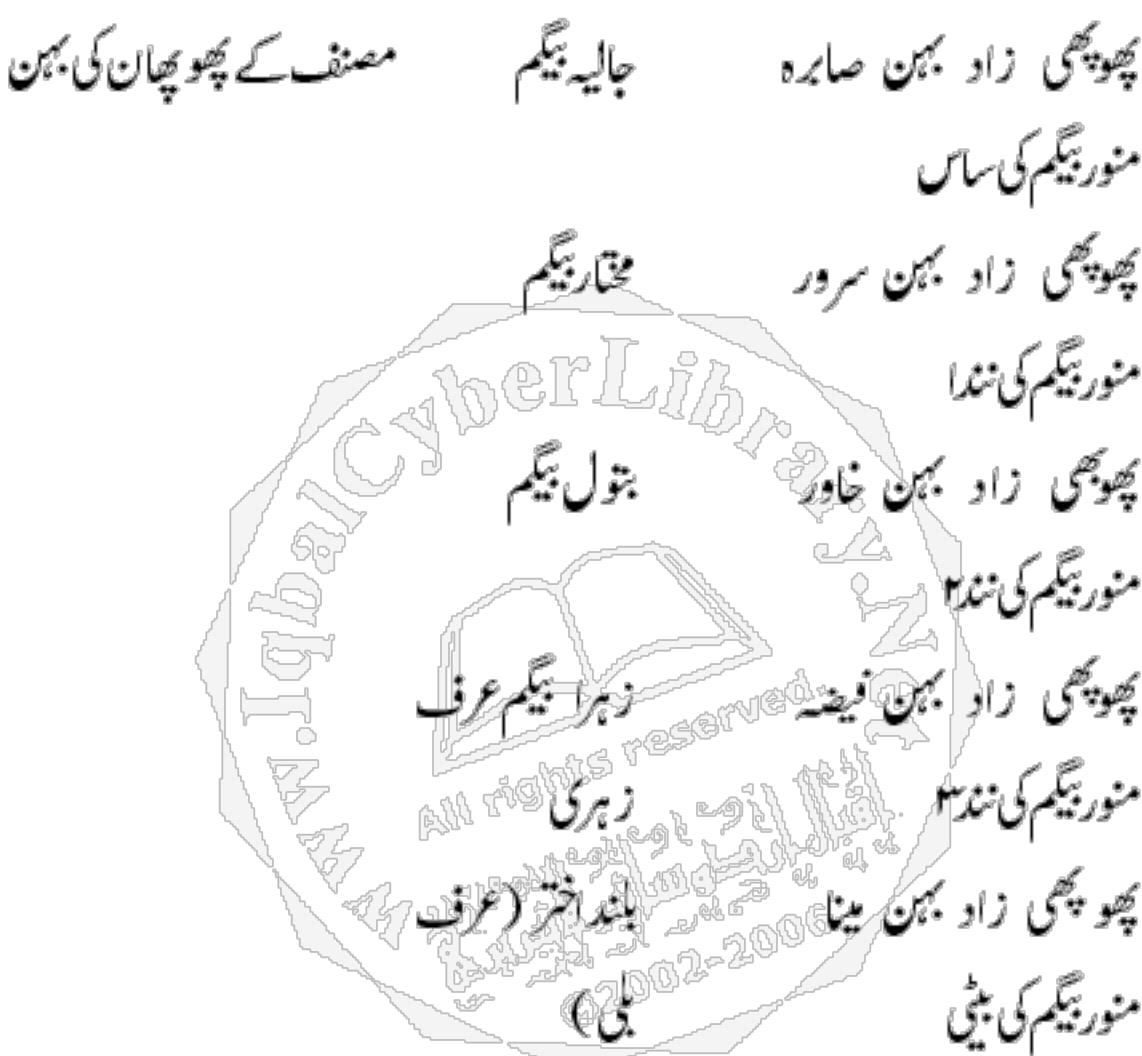
ماموں زاد بھائی چانناں بدر النساء کرامت علی کی ساس (عرف بدراں)

پھوپھی زاد بہن نقی نذر تول کاپٹا

بیٹی ارشیدہ سلطان کے بعد فضل حق کی زوجہ

حیدہ قریش بیگم پھوپھی زاد بہن ہمدانی منور بیگم کا خاوند

گیلانی



پھوپھی زاد بہن صابرہ  
منور نیگم کی ساس  
پھوپھی زاد بہن سرور  
منور نیگم کی نندا  
پھوپھی زاد بہن خاور  
منور نیگم کی نندا  
پھوپھی زاد بہن فیضہ  
منور نیگم کی نندا  
پھوپھی زاد بہن مینا  
منور نیگم کی بیٹی  
پھوپھی زاد بہن پروین  
لطیف نیگم کا خاوند  
ڈاکٹر فیض الحسن ۱۹۲۰ء میں بیسائی ہو گیا۔ نیا  
نام سیموئیل فیض تھا ڈاکٹری  
کرنے کے بعد فوج میں  
لیفٹینٹ ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں  
پھر مسلمان ہو گیا۔ ۱۱۹ اکتوبر  
۱۹۲۷ء کو وہی (پیہاڑ گنج) میں  
ڈیوبی پر شہید کر دیا گیا اس  
وقت چیف میڈیکل آفیسر  
آف ہیلتھ وہی تھا

شیخ محمد افضل  
پھوپھی زاد بہن فاضل  
سردار نیگم کا خاوند

پھوپھی زاد بہن الطاف شیخ محمد اسلم

سردار بیگم کا جیٹھے

شیخ محمد اکرم

پھوپھی زاد بہن غفور

Cyber Library

سردار بیگم جیٹھے ۲

شیخ محمد جعفر

پھوپھی زاد بہن ظفر

زوجہ محمد حسین

سردار بیگم کا جیٹھے ۳

فیض بتوں

خالہ نمبر ۱

All rights reserved.

خالہ کا خاوند

محسن علی و محسن حسن

خالہ کا پیٹا

پروفیشنل ذا کر فیض الحسن متذکرہ بالا سیموئیل فیض  
مصنف کی پھوپھی زاد بہن

لطیف بیگم کا خاوند

خالہ کی بیٹی ۱ آصفہ مختار بیگم (عرف زوجہ سید عبدالجبار)

(بی بی)

خالہ کی بیٹی ۲ سعیدہ حفیظ بیگم زوجہ محمد طفیل (لا ولد انتقال  
کیا)

۳ کاثوم رضیہ بیگم زوجہ سید فضل کریم ہاشمی کاثوم  
باب "غفوان" شباب  
(چوزے اور گدھ) میں  
زبیدہ لکھا گیا۔

ڈاکٹر فیض الحسن اور ساحر  
منظہر ساحر کا نام باب "دیواریں  
(خوناک موڑ)" میں عماوی  
لطیف بیگم کا پیٹا  
(امی) لکھا گیا۔

حالة زاد بہن مختار مولانہ عبداللہ سید عبد الجمید

بخاری

بیگم کا خاوند

سید عبد الجمید

حالة زاد بہن متاز اجلیل

شامکر بخاری

بیگم کا پیٹا

سید عبد الوحید

حالة زاد بہن مختار ۲۰ حید

بخاری

بیگم کا پیٹا

محمد طفیل

حالة زاد بہن حفیظ حسین رین

بیجھائی

بیگم کا خاوند

فضل ابریم

حالة زاد بہن رضیہ رحم علی

بیشی

بیگم کا خاوند

ذکیہ بیگم

حالة زاد بہن رضیہ اثرہ

چراغ دین عرف گورا

بیگم کی بیٹی

رقبہ بیگم

حالة زاد بہن رضیہ ۲ حاصہ

بیگم کی بیٹی

چراغ دین متذکرہ بالاذکیہ بیگم کا خاوند

حالة زاد بہن رضیہ نور علی

عرف گورا

بیگم کاداماو

فضل بتول زوجہ داروغہ محمد شفیع مفتی تھے

حالة نمبر ۲ --

(عرف بتول) مگر المشہور رواو غ

محمد عظیم

حالة نمبر ۲ کا خاوند

یوسف

حالة نمبر ۲ کا پیٹا

محمدہ بیگم

والدہ کی پچھی

زوجہ احسان علی

ماں محمدہ

والدہ نمبر ۳ کی استانی، بیگماں حسین بی بی	والدہ
مصنف یا اس کے فرضی نام	کیفیت
اصلی نام	عزمی سے رشتہ
کشور سلطانہ	والدہ نمبر تین کی انتظامہ
مصنف کی سوتیلی بہن	بیٹی
النور سلطانہ	والدہ نمبر تین کی ۱۲ اخجم
All rights reserved	بیٹی
قرآن ملکی مریضی	والدہ نمبر تین کا قاسم
@ 2002-2006	بھائی
فاطمہ بیگم	والدہ نمبر تین کی شاد
حکیم	بھائیجی
والدہ نمبر چار کی رحمن	والدہ
ساجو	والدہ نمبر چار کی اساجو
آجو	والدہ نمبر چار کی بہن
آجو	والدہ نمبر چار کی بہن
مشتاق احمد	والدہ نمبر چار کا شیر علی، شیر و
(عرف چکا)	پچھولگ بیٹا
اصیل	بیٹا
امجد حسین	مصنف کا سوتیلا بھائی
وزیر	۲ او زیر
ارشد حسین	مصنف کا سوتیلا بھائی
نوید حسین	۳ کبیر
مصنف کا سوتیلا بھائی	

محلہ مفتیاں کے تھانیدار ملک غلام اکبر والدعاشق حسین بٹالوی  
(عرف لا بھا)

عقب میں حولی کا

مالک

حکیم

حکیم فضل حق

حاجی گزار احمد

بازی وala

چند کریکٹر

مبارک احمد حاجی گزار احمد کا عزیز

بالا reserved  
rights (عرف بائیکھا)

(۱۶)

رضا  
الدین محلہ میں مصنف کے ساتھی

ضیاء ندا حسین چراغ الدین کا بھائی

اکرم محمدفضل

ارحمند ذاکر محمد رفع دو بھائی

رفیق سخاوت علی متذکرہ بالا ماموں زاد بھائی

مصنف

جمیل کرامت علی متذکرہ بالا ماموں زاد بھائی

مصنف

جلیل سید عبد الحمید شا مذکرہ خالہ زاد بھن کا پیٹا

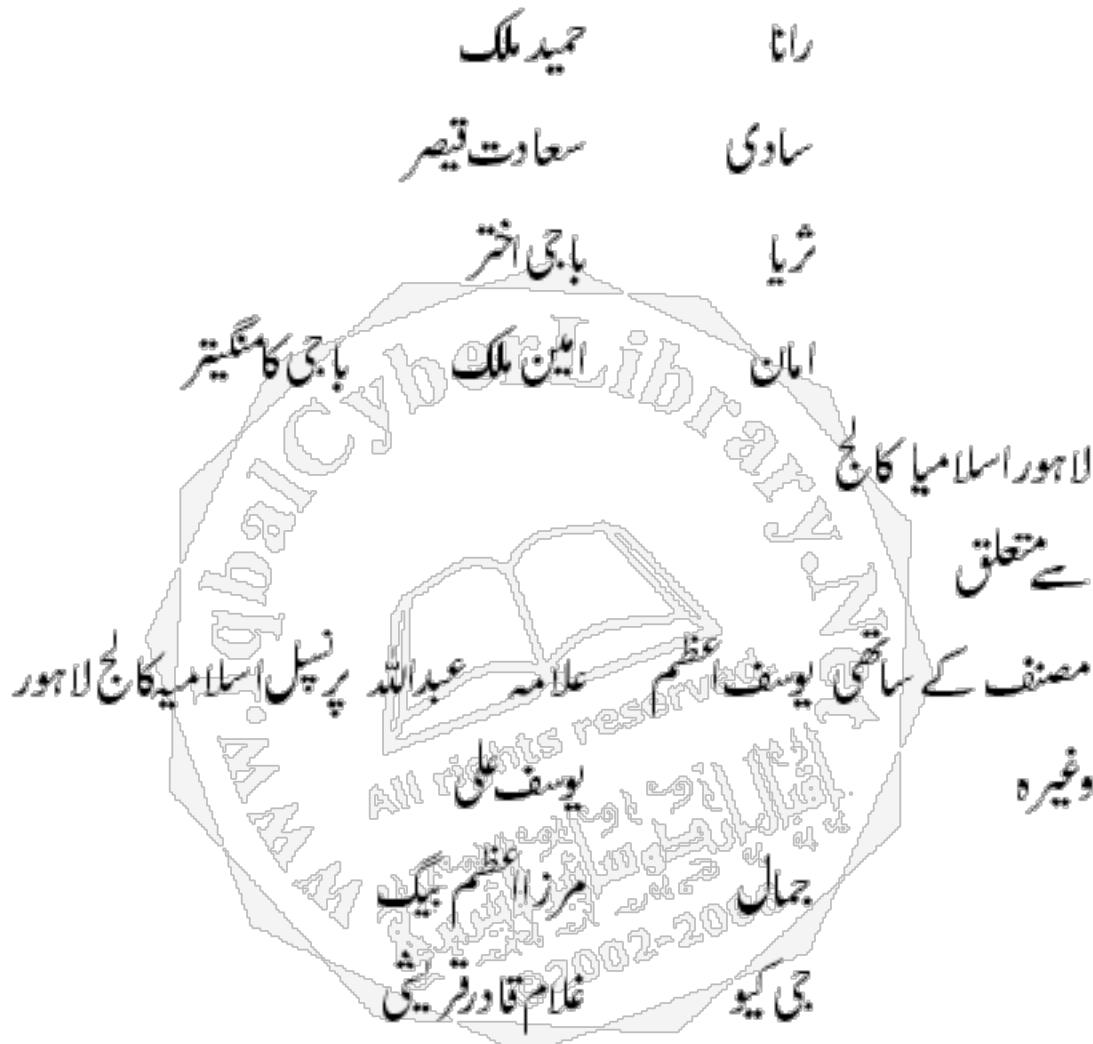
کربخاری

یوسف محمد رفع خالہ زاد بھائی

کرنل مجید ملک

لاہور میں مصنف انصار ملک

متعلق



رانا حمید ملک سعادت قیصر سادی شریا  
باقی اختر ایمن ملک امان  
لاہور اسلامیہ کالج  
متعلقہ مصنف کے ساتھی یوسف عظیم علامہ عبداللہ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور  
وغیرہ جمال بھی کیوں  
سید فیاض محمود بٹالہ کے معروف وکیل  
جاہ خاندان  
سید ضیاء الدین کے بھائی  
بھا گیلانی  
نور احمد اللہ بخش عرف  
کا کا  
امر تر میں مصنف بھائیہ کے ایل بھائیہ پرنسپل ہندو سماج کالج امر تر  
دوسٹ و ساتھی شفیع یوسف  
اللہ داؤ خدا بخش  
حاصل بشیر سیماںی  
سفینہ بشیر سیماںی کی محبوبہ

امر تر مصنف کے آغا  
دوسرا ساتھی

صوفی واحد بخش کی بہن

صوفی واحد بخش کی بہن

صوفی واحد بخش کا بھائی

حی کی عاشق

Cyber Library

حی

ممتاز طوائف

تیم

نیم

ممتاز



منگری غلام

(ساییوال)

الاطاف لطیف

ارشد سعید

نورانی قاضی

گوجرد مسعود شيخ مبارک اسماعیل ہبیڈ ماسٹر ایم بی ہائی اسکول  
گوجرد

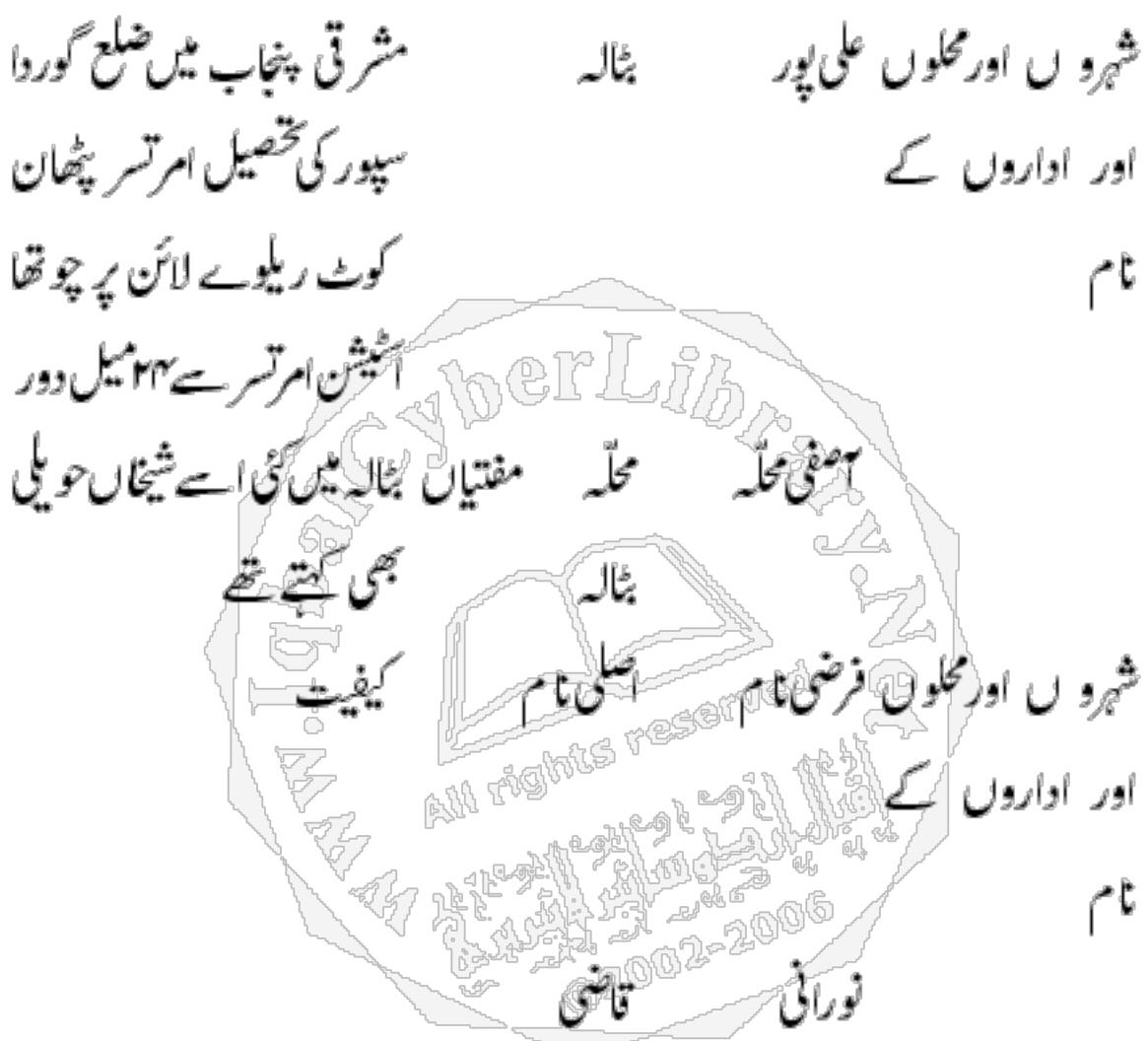
مسٹر معروف ایس ایم شریف ڈویٹی نل اسپکٹر سکولز ملتان بعد  
میں وفاتی سیکر ٹری تعلیم

ہوئے

فضل قمر الدین ڈاکخانے میں ملازم

# شیر خلیل (عرف عربی پچھر ۲۶)

جادہ	سلطان محمود مصنف کشمیر اداں ہے ”حالیہ“
قصور	گورداں اپور
بہمنی	کرشن چندر ادیب
لہ صیانہ	لہ دھیانہ کے مشہور ہومیو پتیخہ
معانج	ڈاکٹر محمود
میراجی	مہندر چندر کا بھائی
میراجی	میرا جی محمد ثناء اللہ ثانی شاعر
پتیتمان	المعروف ش
فرید	پرمیلا دیوی فلم انار
زابدہ	فرید کی بہن امیر
عابدہ	فرید کی بہن ملوک



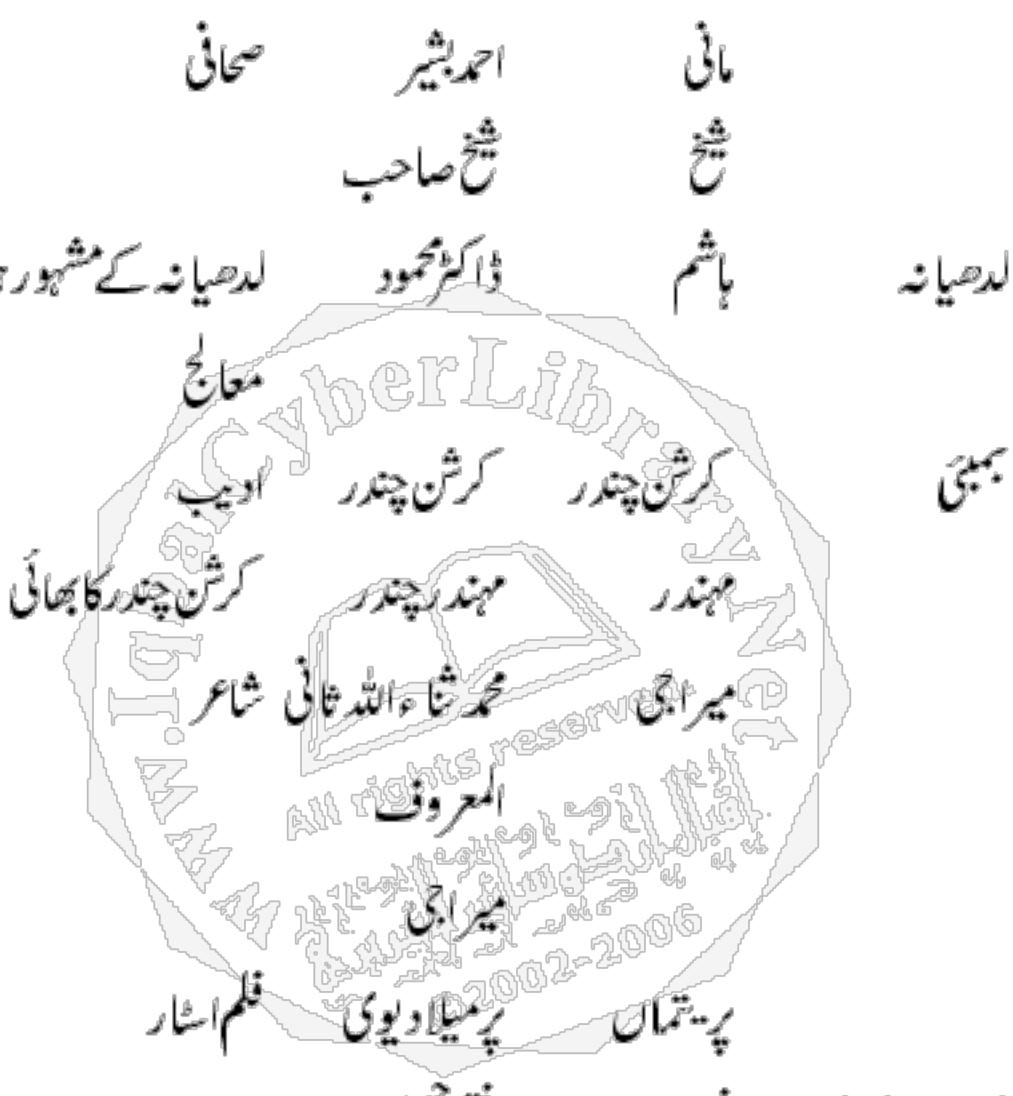
گوجرہ مسعود شيخ مبارک اسماعیل ہمیڈ ماسٹر ایم بی ہائی اسکول گوجرہ

مسٹر معروف ایس ایم شریف ڈویٹنل انسپکٹر سکولز ملتان بعد میں وفاتی سیکرٹری تعلیم ہوئے

افضل قمر الدین واکنگے میں ملازم  
شیر خلیل (عرف عربی پچھر  
(آغا)

جادہ سلطان محمود مصنف کشمیر اداں ہے ”حالیہ“  
ہاشمی مقیم انگستان“

قصور	ناظم	اعظیم مرزا	گورداں پور
	رنگی	اشفاق حسین	



ڈیرہ غازی خاں	فرید	افتخار حسین
زاہدہ	امیر	فرید کی بہن
حابدہ	ملوک	فرید کی بہن
شہروں اور محلوں علی پور	بٹالہ	مشرقی چنگاب میں ضلع گوردا
اور اداروں کے نام		سپور کی تحریک امرتسر پٹھان
		کوٹ ریلوے لائن پر چوتھا
		اسٹیشن امرتسر سے ۲۲ میل دور
		اصفی محلہ
		محلہ مفتیاں بٹالہ میں کئی اسے شیخاں ہو یا
		بھی کہتے تھے
		کیفیت
		اصلی نام
		شہروں اور محلوں فرضی نام
		اور اداروں کے نام

قاضی دروازہ ٹھٹھیاری

دروازہ بٹالہ

پٹھان کوٹ سے آگے ہل دھرم سالہ

آشیشن دھرم سالہ



امر تر امر تر

کٹھہ رنگین کٹھہ گھینیاں طوائف بازار

امر تر

گروپن گور داس پور

دورہا لدھیانہ

دولت پورہ انبالہ

خان پور ملتان

دیپال پور خانیوال

مشتری شاہوال

ساهیوال

چلخ فیصلہ آباد (لائل پور پر) جاوڑہ گوجرد

(اندام)

چک جھرہ  
چک بالا  
شہاں وال

ریاست پیالا  
پیالا  
اجالا



بام آباد ڈیرہ فازی پرانا شہر وہ روپیہ ہے۔ پھر نیا  
خان شہر تعمیر کیا گیا  
رام پور ڈیرہ خان کی تحریک  
شہاں کا کو جلو یہاں تاریخیں کی فیکشی ہے۔

-----**The End**----- ختم شد -----